چسکا
حسن رہبر

چسکا

(افسانوی مجموعہ)

حسن رہبر

تقسیم کار

نرالی دُنیا پبلیکیشنز

A-358، بازار دہلی گیٹ، دریا گنج، نئی دہلی – 110002

موبائل: 0-9811270387

ای میل: niraliduniyapublications@yahoo.com

اس کتاب کی اشاعت میں بہار اُردو اکادمی پٹنہ کا مالی تعاون شامل ہے

نام	:	محمد ابرار الحسن
قلمی نام	:	حسن رہبر
ولادت	:	14 / مارچ 1942ء
پتہ	:	اشرف بلڈنگ، حسین آباد، بھاگلپور-812005

سنِ اشاعت	:	2012ء
تعداد	:	600
قیمت	:	ایک سو پچاس روپے
کمپوزنگ	:	نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی
سرورق	:	انعم آرٹس، دہلی
مطبع	:	ایم۔آر۔آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی-2
ناشر	:	مصنف
زیرِ اہتمام	:	مکتبہ کوہسار، بھیکن پور-3، بھاگلپور-812001

ملنے کے پتے

- مکتبہ کوہسار، بھیکن پور-3، بھاگلپور-812001
- نرالی دُنیا پبلی کیشنز، 358-A، بازار دہلی گیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-110002
- نیو کتاب منزل، تاتار پور، بھاگلپور-812002
- بک امپوریم، سبزی منڈی، پٹنہ-4

کتاب میں شائع مواد سے بہار اُردو اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔
کسی بھی قابلِ اعتراض مواد کی اشاعت کے لیے خود مصنف/مرتب ذمہ دار ہے۔

اپنے کرم فرما

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

کے نام

چھڑی تھی بحث تری بزم میں زمانے کی
چھُپی تھی جس میں لطافت مرے فسانے کی

—— حسن رہبر

ترتیب

کہی اَن کہی

میرا پہلا افسانوی مجموعہ 'ایک پل کا فاصلہ' جس طرح ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا اور اسے جو شہرت اور مقبولیت ملی اس سے مجھے بڑا حوصلہ ملا ہے۔

یہ دوسرا مجموعہ 'چسکا' بھی میرے قارئین کے ادبی ذوق کی تسکین کرے گا اس کا مجھے یقین ہے۔

سماجی، تہذیبی اور انسانی قدروں کی شکست وریخت کے مرحلوں سے گزرنے کے بعد معروضیت اور موضوعیت کی ازلی کشاکش نے مجھے زندگی کا شعور بھی بخشا اور اپنے اِرد گرد کی دنیا کو حسین اور مہذب بنانے کی بے پایاں آرزو بھی جو وقتاً فوقتاً مجھے اپنے خوں گشتہ اوراق کے ساتھ رسائل وجرائد کے صفحات کی زینت بناتی رہی۔

یہ ساری کہانیاں جو سب کچھ کہہ کر بھی مجھے ادھورے پن کا احساس دلاتی رہی ہیں یقیناً میرے قارئین کو تکمیل کے احساس سے قریب کریں گی۔ اس پُرشور اور مختلف النوع آوازوں سے بھری ہوئی کائنات میں اگر آپ ایک پل کے لیے بھی میری آواز سے ہم آہنگ ہو سکے تو یہی میری کامیابی بھی ہے اور اگلی سمتوں کا تعین بھی۔

قاری کے ذہن کو اپنی تحریروں سے باندھے رکھنا ایک مشکل فن ہے جس پر بڑے ریاض کے بعد قابو پایا جاتا ہے۔ شکر ہے کہ جب قاری ذہنی سفر کے انبساط انگیز لمحوں میں کھو کر میرے ساتھ آخری موڑ پر پہنچتا ہے تب اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جو کچھ دیکھا اور سنا ہے وہ اس کے دل کی آواز سے مختلف نہیں اور یہی فکر اس کے ذہن کو ایسا جھٹکا دیتی ہے کہ چونک پڑتا ہے اور کہانی کے کردار دیر تک اس کے ذہن میں گونجتے رہتے ہیں۔ میری

اس انفرادیت کو دانشوروں نے سراہا ہی نہیں بلکہ اسے میری پہچان کی سند بھی عطا کی ہے۔

میری کہانیاں زندگی سے جڑی ہوتی ہیں۔ان کے کردار جیتے جاگتے ہیں۔ میں جن حالات سے گزرا ہوں، جو کچھ میں نے دیکھا، سوچا اور پرکھا ہے اپنے ان ہی تجربے اور مشاہدے کو کہانی کی بنیاد بنائی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ میری کہانیوں نے بین الاقوامی سطح پر بھی ناقدوں کا دھیان اپنی طرف کھینچا ہے اور وہ اس سچائی کے اعتراف میں قلم اٹھانے پر مجبور ہوئے ہیں۔

فن میں نیا اور بالکل اچھوتا تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ہاں! فنکار کا طرزِ احساس واظہار ان میں ندرت بھی پیدا کرتا ہے اور تاثیر بھی۔

اگر میری تحریریں آپ کو ندرتِ نظر کے قریب لے جائیں تو فگار انگلیوں اور خامۂ خونچکاں کو ان کا صلہ مل جائے گا۔

——حسن رہبر

ہارا ہوا کارگل

اس روز فرزانہ کی دوسری شادی کی پہلی سالگرہ کے موقع پر تحسین نے بڑی شاندار پارٹی کا اہتمام کیا تھا، جس میں فرزانہ کے رشتے داروں کے ساتھ اس کے دوست احباب بھی مدعو تھے۔ پورا گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ ہر طرف حسن ورعنائی کے دلکش اور دل فریب جلوے بکھرے تھے۔ فرزانہ سرخ جوڑے میں ملبوس بڑے ہال کے وسط میں سجے ٹیبل کے سامنے کھڑی مبارک باد دینے والے مہمانوں کا اپنی مخصوص مسکراہٹوں سے جواب دے رہی تھی۔ ٹیبل پر ایک طرف خوشنما پیکٹ سجتے جارہے تھے۔

جشن کے ہنگامے تھمے تو مہمانوں کی ضیافت کا انتظام ہونے لگا۔ ڈائننگ ٹیبل پر بریانی کے قاب، چکن کے پیالے اور میٹھے کی پلیٹیں سجائی جانے لگیں تو فرزانہ مہمانوں کی نظریں بچا کر چند لمحوں کے لیے ستانے اپنے کمرے میں چلی آئی اور بستر پر لیٹ کر ٹیلی ویژن آن کر دیا۔

دوسرے ہی لمحے ٹیلی ویژن کے پردے پر نہایت چست لباس زیبِ تن کیے ایک خوبصورت دوشیزہ نمودار ہوئی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور دوپٹہ گلے سے لپٹا تھا۔ وہ عالمی خبریں سنا رہی تھی۔

گزشتہ پانچ برسوں کے دوران ہندو پاک کے تعلقات میں بڑی خوشگوار تبدیلی آئی تھی۔ کارگل جنگ کی کڑواہٹ بھول کر دونوں ممالک ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ یگانگت اور خیر سگالی کے اسی جذبے کو فروغ دینے کے لیے ہندوستان کے دو جنگی قیدیوں کی رہائی عمل میں آئی تھی، جو برسوں سے پاکستان کی جیلوں میں قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے

تھے۔ ان میں ایک جالندھر کا رگھبیر سنگھ تھا اور دوسرا میرٹھ کا عابد، جنھیں بڑی عزت و احترام کے ساتھ ہندوستان بھیج دیا گیا تھا۔

عابد کے نام پر فرزانہ سہم گئی۔ ایک انجانا سا خوف اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ کارگل کے سوئے ہوئے زخم ایک دم سے جاگ پڑے۔

عابد میرٹھ کے ایک دور افتادہ گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد کی علاقے میں بڑی عزّت اور اچھے اثر ورسوخ تھے۔ اس کے والد اور بڑے بھائیوں نے بھی جنگِ آزادی میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ انگریزوں کے ڈنڈے کھائے تھے۔ کال کوٹھری کی اذیتیں اٹھائی تھیں اور ہمیشہ اخبار کی سرخیوں میں رہے تھے۔ لیکن جب آزادی ملی تو ملک میں فرقہ واریت کی ایسی لہر اٹھی کہ زمانے نے ان کی قربانیوں کو بھلا دیا۔ آزادی حاصل کرنے والے جانبازوں کی کسی صف میں عابد کے گھرانے کو جگہ نہ ملی۔

شروع سے ہی عابد کو ایسی تربیت ملی تھی کہ سماجی خدمت اور وطن دوستی کا جذبہ اس کے اندر بیدار ہو گیا تھا اور ملک وقوم کے لیے کچھ کر دکھانے کی چاہ من میں انگڑائیاں لینے لگی تھی اور ایک دن اس کی یہ تمنا پوری ہوتی نظر آئی جب بحالی کے دفتر سے انٹرویو کے لیے اس کا بلاوا آ گیا اور کڑی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد فوج میں اس کی بحالی ممکن ہو سکی اور اسے ٹریننگ کے لیے دُور افتادہ شہر کے ایک ٹریننگ سینٹر بھیج دیا گیا۔

عابد ایک فرض شناش اور ذمہ دار سپاہی تھا۔ فوجی تربیت حاصل کرنے کے بعد وہ جہاں اور جس مقام پر بھی رہا، اس نے ہمیشہ والدین کی نصیحتوں کو پیشِ نظر رکھا کہ اسے ملک وقوم کی خدمت کا جو موقع ملا ہے وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہیں برتے گا اور ہمیشہ آزمائشوں کی کسوٹی پر کھرا اُترے گا کہ یہی اس خاندان کی روایت رہی ہے۔

عابد کی جونہی فوج میں بھرتی ہوئی ماں کو ایک بہانہ مل گیا۔ اس کی تو بس اب ایک یہی خواہش تھی کہ کب بیٹا دو پیسے کمانے کے لائق ہو کہ وہ اس کا گھر بسا کر اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائے۔ لڑکی تو اس نے پہلے ہی دیکھ رکھی تھی۔ فرزانہ سینکڑوں میں ایک تھی۔ ناک نقشہ اچھا اور قد وقامت بھی مناسب تھا۔ ذات برادری کے معاملے میں بھی اسے چھان بین

کی ضرورت نہیں تھی۔ فرزانہ عابد کے گھر بیاہ کر آئی تو گھر کا ماحول ہی بدل گیا۔ آنگن میں بہاروں نے اپنے ڈیرے جما لیے۔ ہر طرف مسکراہٹوں کی کلیاں کھل اٹھیں۔ زندگی کا یہ سفر جس میں اپنائیت کا جذبہ تھا، پیار کی مہک اور خوابوں کے اُجالے تھے، انھیں بڑا دلچسپ اور خوش گوار نظر آنے لگا۔ مگر یہ خوشیاں زیادہ دُور تک ان کا ساتھ نہ دے سکیں۔

شادی کو محض دس دن ہی ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں رچی مہندی کا رنگ بھی نہیں اُترا تھا کہ کارگل میں اچانک جنگ چھڑ گئی۔ ہند و پاک نے اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا اور دونوں ممالک کی فوجیں اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کرنے لگیں تو سرحدوں کی حفاظت کے لیے عابد کو بھی محاذِ جنگ پر بھیج دیا گیا۔ عابد کے سامنے آزمائشوں کی گھڑی تھی۔ وہ ارادے کا پکّا ایک جانباز سپاہی تھا۔ اس نے ڈیوٹی کے درمیان کئی اہم کام انجام دیئے تھے، اسی لیے اس کے افسروں کو اس کی ذات پر بڑا بھروسہ تھا۔

اس روز جب وہ کارگل کے ایک مورچہ پر ڈٹا ہوا تھا اور گھمسان کی جنگ جاری تھی، اس نے اپنے فن کے خوب جوہر دکھائے اور دشمنوں کو کھدیڑتا ہوا ان کے پیچھے بہت دُور تک نکل گیا۔ لیکن جب پلٹ کر دیکھا تو اس کی ہمّت جواب دے گئی۔ جنگ کے میدان میں کودنے والے کبھی جان کی پرواہ نہیں کرتے، لیکن وہ تو پوری طرح دشمنوں کے گھیرے میں آ گیا تھا۔ ذرا بھی حرکت کی تو موت یقینی تھی اور دشمنوں کے نرغے میں پھنس کر ہتھیار ڈالنا نہ تو بزدلی ہے اور نہ عیب کی کوئی بات۔ مفت میں جان گنوانے سے کیا فائدہ؟ اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ پکڑ لیا گیا اور لوگ اس سے بے خبر ہو گئے۔

مگر جنگ تو کسی مسئلے کا حل نہیں؟ جنگ سے تو نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مزید اُلجھنیں بڑھتی ہیں۔ کارگل کی جنگ کئی ہفتے چلی۔ دونوں پڑوسی ممالک کو بھاری جانی اور مالی نقصانات اٹھانے پڑے۔

شروع سے ہی دنیا والے اس جنگ کو لے کر فکر مند تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح اس کا خاتمہ ہو۔ لیکن جب طول کھینچنے لگی اور خطرہ بہت بڑھ گیا تو بیدار ذہن لوگ حرکت میں آئے اور بااثر لوگوں نے بیچ میں پڑ کر معاملے کو سلجھا دیا اور آپس میں صلح صفائی کرا دی تو دھیرے

دھیرے حالات سدھر گئے اور دونوں ممالک کے درمیان اعتماد اور دوستی کی نئی فضا قائم ہوگئی۔

لیکن کارگل کی ہاری ہوئی بازی جیت لینے کے بعد بھی اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوگا کہ عابد پانچ سال تک پاکستان کی جیلوں میں رہ کر تنہائی کے دُکھ جھیلتا رہا اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ لوگ حیرت میں تھے کہ برسوں عابد کی گمشدگی پر پردہ پڑا رہا، لیکن حکومت سچائی جاننے میں ناکام رہی۔ وہ کون سی مجبوری تھی، کیا اسباب تھے جس کی وجہ سے اس کی تلاش میں کوتاہی برتی گئی؟ حالانکہ محاذِ جنگ پر جانے والے تمام فوجیوں کی دیکھ بھال کی ذمے داری ان کے افسروں پر ہوتی ہے۔ فوجیوں کے مارے جانے، زخمی ہونے یا لاپتہ ہوجانے پر انھیں تلاش کرنا، ان کے لواحقین کو معاوضہ دلانا، ان کے فرائض میں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ عابد کا تھا، اور کس کو پڑی تھی کہ عابد جیسے ایک معمولی سپاہی کے لیے اپنی جان ہلکان کرتا۔ سو اپنی آئینی ذمہ داریوں کو بھول کر فوج نے اسے بھگوڑا قرار دے دیا۔

عابد کو بھگوڑا قرار دیئے جانے کے بعد اس کے گھر والوں کے سامنے ایک نئی مصیبت کھڑی ہوگئی۔ وہ تو پہلے ہی عابد کے لاپتہ ہوجانے کا دُکھ جھیل رہے تھے۔ ایسے میں پولیس کی پوچھ تاچھ نے ان کی پریشانیاں اور بڑھا دیں۔ اس باز پرس سے عابد کے والدین اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ ان کا سر اٹھا کر جینا مشکل ہوگیا۔ ماں جوان بیٹے کا دُکھ سہ نہیں پائی اور دنیا کو ہی خیر باد کہ گئی۔

کل تک عابد کا گھرانہ کتنا خوش حال تھا۔ لوگ نہایت اطمینان اور سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ وقت نے اچانک ایسا شب خوں مارا کہ سارے سپنے بکھر گئے اور زندگی کی بساط ہی الٹ کر رہ گئی۔

حالانکہ اب بھی فرزانہ کے من میں ایک بھرم تھا۔ ایک غیر یقینی بھروسہ کہ کسی نہ کسی دن اس کا عابد لوٹ آئے گا۔ لیکن وہ اس بات کو اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ صرف اس کا ایک بھرم ہے اور دل کو بہلانے کے لیے تو بھرم پالنے ہی ہوتے ہیں۔

آہستہ آہستہ وقت گزرتا رہا۔ کارگل کی جنگ کو ختم ہوئے تین سال بیت گئے، مگر عابد کا کوئی پتہ نہیں چلا تو اس کی واپسی سے نا اُمید ہوکر سب نے اسے مردہ سمجھ لیا۔

فرزانہ تو ابھی ٹھیک سے جوانی کی سرحدوں میں قدم جمانے بھی نہ پائی تھی کہ اسے بیوگی کا دکھ جھیلنا پڑا۔ زندگی کے لمبے سفر میں تنہا عورت کی زندگی یوں بھی بارِگراں محسوس ہونے لگتی ہے۔ شرمندگی کے اس بوجھ سے فرزانہ کو نجات دلانے کی فکر میں تو سبھی تھے اور اس کے لیے کسی مناسب رشتے کی تلاش بھی جاری تھی، مگر ڈھنگ کا کوئی لڑکا مل نہیں رہا تھا۔

اتفاق سے ایک روز پاس کے ہی ایک گاؤں سے اس کے کسی دور کے رشتے دار کا اس کے لیے پیغام آ گیا۔ تحسین قد کاٹھی کا اچھا تھا۔ اس کے مزاج اور سیرت سے بھی لوگ واقف تھے۔ سارا معاملہ نہایت خوش اسلوبی سے طے پا گیا اور نہایت سادگی کے ساتھ تحسین کے ہمراہ فرزانہ کی شادی انجام پا گئی۔

تحسین کے دل میں فرزانہ کے لیے بے حد پیار تھا۔ فرزانہ بھی اس پر جان چھڑکتی تھی۔ زندگی کے شب و روز اپنی تمام تر رعنائیوں اور دلچسپیوں کے ساتھ بڑے پُرسکون گزر رہے تھے کہ ایک روز فرزانہ نے اسے نئی سوغات کی خوش خبری دی تو تحسین کا چہرہ کھل اٹھا اور پورے گھر میں خوشیوں کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

لیکن اپنی دوسری شادی کی پہلی سالگرہ کے دن، ٹیلی ویژن پر عالمی خبریں سن کر، اس کے زخموں کے تمام ٹانکے ایک دم سے کھل گئے اور وہ اس بھری دنیا میں آنسو بہانے کے لیے اکیلی رہ گئی۔

اسے محسوس ہوا جیسے کارگل سے آتی ہوئی برفیلی ہواؤں میں اس کا پورا وجود برف کی مانند پگھل کر رہ جائے گا۔

○○

بگولے

میں عجب اُلجھن میں مبتلا ہوں!

وقت کی کوئی کروٹ مجھے چین لینے نہیں دیتی۔ ہر پل ذہن کو ڈستی رہتی ہے۔ میں بے آس اور نامراد ایک ایسے دوراہے پر آ کر بھٹک رہا ہوں جہاں سے آگے کوئی راہ نہیں جاتی اور واپسی کے سارے دروازے بند ہو چکے ہیں۔

تمنّا سامنے ہوتی ہے تو روحی کو بھول جاتا ہوں اور جب روحی قریب رہتی ہے تو تمنّا کو ذہن سے اُتارنے کی کوشش کرتا ہوں۔

یہ میرے وجود کی کون سی کمزوری ہے، کیسی بے بسی، جو مجھ سے میرا احساس چھین رہی ہے۔ کہیں سکرات کا یہ لمحہ میری روح کو منجمد نہ کر دے۔

تمنّا بہت دھیرے دھیرے میری ہمراز بنی تھی اور من کو ایسا بس میں کر لیا تھا کہ مجھے دل کو کھو بیٹھنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ لیکن روحی کی طرف میرا جھکاؤ تو بڑا ہی دانستہ تھا اور اس کی آنکھوں میں نئے خواب جگانے کے لیے مجھے بڑے جتن کرنے پڑے تھے۔

تمنّا میری خالہ زاد بہن تھی، منجھلی خالہ کی واحد اولاد۔ جب وہ چھوٹی تھی تبھی بڑی خالہ نے اسے اپنے بیٹے کاشف کے لیے پسند کر لیا تھا۔ تب سے تمنّا کاشف سے منسوب سمجھی جانے لگی تھی۔ میں کاشف کا ہم عمر تھا اور میری ماں بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی۔

چند سال بعد ہی جب تمنّا کی ماں ایک سڑک حادثے میں ماری گئی تو سب کو اس کے درد بانٹنے کی فکر ستانے لگی۔ کاشف کی ماں نے اسے اپنے ساتھ کانپور لے جانا چاہا، مگر موروثی جائداد کے بکھیڑوں کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا اور میری ماں اسے اپنے یہاں لے آئی۔

تمنا بہت بھولی بھالی معصوم لڑکی تھی۔ ہم اکثر ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ اس کے میرے یہاں آ جانے سے گھر میں ایک نئی بہار آ گئی اور دھیرے دھیرے دوستی میں چاہت کا رنگ بھرنے لگا اور ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر جینے لگے۔

وقت گزرتا رہا۔ لڑکپن کے دن بیت گئے۔ تمنا نے اسکول کی پڑھائی پوری کر لی اور میں بی۔ اے کے بعد نوکری سے لگ گیا۔ ایک بڑی فیکٹری کی نئی برانچ آفس میں اسسٹنٹ منیجر کے طور پر کام کرتے ہوئے کئی ماہ گزر گئے۔ اسی درمیان زندگی ایک حادثے کا شکار ہو گئی اور میں ایک ایسے موڑ پر پہنچ گیا جہاں دفتر کی زندگی میرے لیے بڑی ہنگامہ خیز بن گئی۔

رُوحی میری نئی اسٹینوگرافر تھی۔ بے حد خوبصورت، مگر بہت سنجیدہ اور سادگی پسند۔ ہر کام سلیقے سے کرتی۔ اس نے کبھی مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ہمیشہ میرے اشارے کی منتظر رہی۔ میں نے بھی اپنے اور اس کے درمیان برابر ایک فاصلہ قائم رکھنا چاہا تا کہ عہدوں کے بیچ کا فرق برقرار رہے۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ نہ جانے دوری اتنی کیسے سمٹ گئی کہ فاصلہ ختم ہونے کا احساس بھی نہ ہو سکا۔

روحی کی زندگی دُکھوں سے عبارت تھی۔ مقدر کی اندھی لکیروں نے اس کی ہر خواہش کو دُھندلا دیا تھا۔ وہ بے حد جذباتی لڑکی تھی۔ پڑھائی کے دوران اس نے مراد کو اپنے خوابوں میں بسا لیا تھا اور گھر والوں کی مخالفت کے باوجود اس سے شادی کر لی تھی۔

چھوٹے سے گھر اور معمولی ملازمت کے سوا مراد کے پاس کچھ نہیں تھا، مگر اپنی اس چھوٹی سی دُنیا میں ہی دونوں خوش تھے۔ زندگی بڑی پر کیف اور پر لطف گزر رہی تھی کہ ایک دن جب وہ حسبِ معمول دفتر جانے کے لیے بس اڈّے پر کھڑا تھا تو بموں کے دھماکے نے اس کی ساری دُنیا تہہ و بالا کر ڈالی۔ دھماکہ کسی تخریب کاری کا نتیجہ تھا اور اتنا شدید تھا کہ پاس پڑوس کی تمام عمارتیں ہل گئیں۔ بہت سے لوگ ہلاک اور مجروح ہوئے۔ مرنے والوں میں مراد بھی شامل تھا۔

روحی کو حیرت تھی کہ اتنی اندوہناک خبر سن کر بھی وہ کس طرح زندہ رہی۔ اس کا ہنستا مسکراتا گھر اُجڑ چکا تھا۔ وہ تنہائی کے خوف سے ایک نامعلوم کرب میں مبتلا ہو گئی۔

مگر وقت تو ایسا مرہم ہے جو بڑے سے بڑا زخم بھی مندمل کر دیتا ہے۔ دھیرے دھیرے روحی کے گھاؤ بھی بھرنے لگے۔ اس نے خود پر قابو پالیا اور ٹوٹے ارادوں کو یکجا کر کے نوکری کی تلاش میں جٹ گئی اور زندگی کی ناؤ کو طوفان کی زد سے بچانے میں کامیاب ہو گئی۔

روحی بڑی نفاست پسند تھی۔ اپنے کو سنبھال کر رکھنا تو اسے آتا ہی تھا کام نکالنے کے گُر بھی جانتی تھی۔ جب سے دفتر کی ذمہ داری سنبھالی بہت کچھ بدل گیا۔ مگر اس کے چہرے پر دُکھ کی جو پرچھائیں تھی وہ کم نہ ہوئی۔ حالانکہ میں نے اس کے درد کو بانٹنے کی بڑی کوشش کی۔ بعض اوقات بناوٹ اور تصنع سے بھی کام لیا۔ اس کی دلجوئی کی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجانے کے لیے نہ جانے کتنی بار مجھے اپنے آپ کو مارنا پڑا۔ تب جا کر کہیں وہ اس ماحول میں اپنے قدم جما سکی۔

روحی کو کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے ہر موڑ پر سنبھالا دیا۔ وہ میرے خلوص سے اتنا متاثر ہوئی کہ اس نے میرے خیالوں کو اپنی سانسوں میں بسا لیا۔ فرصت کے اوقات میں اکثر وہ میرے پاس آ بیٹھتی۔ گھنٹوں ہم لوگ سرگوشیوں میں اُلجھے رہتے۔ وہی بے تکلفی اور شوخی بھرا انداز۔ بالکل دیرینہ دوستوں کی طرح۔ باتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ۔

تمنا مجھے دل سے چاہتی ہے اور میں روحی کی چاہت کا جواب بظاہر پیار سے دے رہا ہوں۔ دفتر کے اوقات میں جب مجھے تمنا کا خیال آتا ہے تو اپنے آپ کو فائلوں میں اس طرح مصروف رکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ اس کی طرف دھیان نہ جائے، مگر ایسا ہو نہیں پاتا۔ اور جب روحی میرے قریب رہتی ہے تو مجھے سب کچھ بھول جانا پڑتا ہے۔ ذہن سے تمنا کے تصوّر کو ہٹا کر پھر روحی سے محو گفتگو ہو جاتا ہوں۔ وہی بے تکلّف دوستوں کی طرح اور وہی دنیا بھر کی باتیں۔

میں مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ زمانے کی زہر آلود آندھیوں نے آنگن میں ایسی گرد اڑائی ہے کہ تصویر کا ہر نقش دُھول کی موٹی تہہ کے نیچے چھپ گیا ہے اور میں حالات کے اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے اکیلا رہ گیا ہوں۔

بار بار سوچتا ہوں۔ کاش روحی نے میری ہمدردی کے جذبے کو انسانیت تک محدود سمجھا

ہوتا تو اسے خوش اور مطمئن رکھنے کے لیے مجھے جس عذاب سے گزرنا پڑا ہے اس کی تپش کبھی تمنا کو بے چین نہیں بناتی۔ اب تو اس کا شک یقین کی حد کو چھونے لگا ہے۔ اگر اس پر کہیں یہ راز کھل گیا تو زندگی کتنی اجیرن ہو جائے گی۔ میں تمنا کو بہلانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں۔

مگر حقیقت تو لاکھ چھپاؤ نہیں چھپتی۔ آخر ایک دن تمنا کی نگاہوں میں میری محبت کا بھرم ٹوٹ گیا۔ جب پہلی بار روحی سے اس کی ملاقات ہوگئی۔

مجھے دفتر کے کسی کام سے چند روز کے لیے باہر جانا تھا اور روحی کے پاس کچھ کاغذات مکمل کرنے کو رہ گئے تھے۔ میں نے اسے فائل لے کر اسٹیشن بلا لیا تھا کہ میں گھر سے تیار ہو کر وقت پر پہنچ جاؤں گا۔ مگر جب وہ اسٹیشن آئی تو میری گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ چکی تھی۔

مجھے جس گاڑی سے جانا تھا وہ کسی وجہ سے کینسل ہوگئی تھی، مگر اس طرف کو جانے والی ایک اور گاڑی جو کئی گھنٹے لیٹ چل رہی تھی مجھے مل گئی تو روحی کا انتظار کیے بغیر میں نے گاڑی پکڑ لی۔

روحی کو گاڑی کے رد ہونے کی خبر راستے میں ہی مل چکی تھی۔ پھر بھی اس نے میری تلاش میں پلیٹ فارم کا کونہ کونہ چھان مارا۔ اور پھر انتظار کے کرب سے اوب کر مجھ سے ملنے میرے گھر آگئی۔ روحی کو تمنا سے ملک کر بڑی خوشی ہوئی۔ تمنا نے بھی مسکراہٹوں سے اس کا استقبال کیا اور تھوڑی ہی دیر میں دونوں بے تکلف سہیلیوں کی طرح گھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔ جیسے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ تمنا کی گہری ٹٹولتی ہوئی نگاہوں نے اس کا چہرہ پڑھ لیا اور پھر جیسے وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ روحی کی نفسیاتی اُلجھنوں میں اسے اپنے سوالوں کا جواب مل گیا، مگر وہ کچھ بولی نہیں۔ اچانک روحی نے اس سے پوچھ لیا۔

''جمال صاحب سے آپ کی کیا رشتے داری ہے؟''

''میں ان کی بیوی ہوں!'' تمنا بنا کسی ہچکچاہٹ کے بول گئی۔

''بیوی؟'' روحی کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولی۔ اس کا من رو پڑا، لیکن آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ اب تو وہ آنسو بہانے کی حدوں سے بہت آگے نکل چکی تھی۔ وقت نے ایک بار پھر اس کے ساتھ مذاق کیا تھا۔ منزل کی تلاش میں وہ سراب کے

پیچھے بھاگتی رہی تھی۔ اب اسے اسی مقام پر لوٹ جانا چاہیے جہاں اس پکڑ سے وہ خود کو محفوظ رکھ سکے۔ لیکن اچانک کچھ سوچ کر غصہ سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

''تب تو بہن میرے ساتھ بڑا دھوکہ ہوا ہے!''

''دھوکہ! کیسا دھوکہ؟'' تمنا چونک کر اس کا منہ تکنے لگی۔

''جمال نے میرے ساتھ سول میرج کی ہے!'' روحی نے بولتے ہوئے خود کو سنبھالا۔

''شادی، تمھارے ساتھ...؟'' تمنا نے ساری حیرت اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر پوچھا روحی کی خموشی کرب انگیز زندگی کا ایک ٹھہرا ہوا ازلی لمحہ بن گئی۔

''لیکن کب؟'' تمنا سوال کر بیٹھی۔

''پچھلے ماہ، اگر گھر تک میرے ساتھ چلیں تو میں کورٹ سرٹیفکیٹ دکھادوں!'' روحی صاف جھوٹ بول گئی۔ تمنا کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ آنسوں جو آنکھوں میں مچل رہے تھے بہہ نکلے، لیکن روحی نے آنسوؤں کو بہنے سے پہلے ہی پی لیا اور جلے ارمانوں کو سمیٹے وہاں سے نکل گئی۔

کئی دن بعد جب میں ٹور سے لوٹا تو مجھے تمنا سے ملنے کی جلدی تھی مگر کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ گھر جانے کے بجائے آفس میں ہی رُکنا پڑا۔ دورے کی رپورٹ کے ساتھ مجھے ہیڈ آفس کو کچھ ضروری پیغام دینے تھے۔ اسی غرض سے جب میں نے اپنی کرسی سنبھالی تو ٹیبل پر پڑے روحی کے ایک خط نے مجھے چونکا دیا، جس میں وہ میرے لیے کل کی خبر چھوڑ گئی تھی اور تمنا کا ذکر اس انداز میں کیا تھا کہ ایک لمحہ کے لیے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ عود کر آئی، لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کے استعفیٰ نے میرے حواس گم کردیئے اور ٹوٹے ارمانوں کی کرچیاں سارے وجود میں چبھنے لگیں۔ میں کمرے کی گھٹن برداشت نہیں کرسکا اور خود بخود میرے قدم گھر کی طرف بڑھ گئے۔

تھکا ماندہ جب میں گھر پہنچا تو دروازے پر لوٹتی اُداسی میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔ سب کچھ خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اندر خالی کمرے بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی ماں کا چہرہ اُتر گیا۔ اس نے دُکھ بھرے لہجے میں مجھے بتایا کہ بیمار

ماں کی ضد پر کل کاشف اسے لینے آیا تھا۔ اس کی ماں کانپور کے ایک نرسنگ ہوم میں دو چار دنوں کی مہمان ہے۔ میں تو جانے کو تیار تھی۔ اس سے کہا بھی کہ دو ایک دن رُک جاؤ۔ جمال آ لے تو ساتھ چلوں گی۔ مگر وہ نہیں مانا تو میں نے تمنّا کو اس کے ہمراہ جانے کی اجازت دے دی۔ بہو کو ایک نظر دیکھ لینے کی آرزو میں کہیں اس کی ماں کا دم اٹکا ہوا نہیں ہو۔ ابھی تو سب کو گاڑی میں چھوڑ کر دم مارنے بیٹھی تھی کہ تم آ گئے۔

اور مجھے لگا جیسے میں بگولے میں گھر گیا ہوں اور اندر سے ٹوٹ کر میرا سارا وجود سوکھے پتّے کی مانند ہوا میں بھٹکنے کے لیے منتشر ہو گیا ہے۔

OO

چھٹتے بادل

فیصل نے آنگن میں جب قدم رکھا تو سنبل کمرے میں بیٹھی ایک نوجوان کے ساتھ بڑے بے تکلفانہ انداز میں باتیں کر رہی تھی۔ اسے بڑا تعجب ہوا۔ دُھندلی دُھندلی سی تصویر، مانوس سا اجنبی چہرہ۔ معلوم نہیں کون تھا وہ جس کے ساتھ اس کی اتنی قربت رہی ہے۔ ذہن پر زور دینے کے بعد بھی جب اس کی پہچان سمجھ میں نہیں آئی تو وہ سنبل کو آواز دیتا ہوا اس کے کمرے میں جا پہنچا۔ فیصل کو دیکھ کر سنبل کے روبرو بیٹھے نوجوان کو اسے پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ فیصل سے ہاتھ ملایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''مجھے آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا!''

تبھی درمیان میں سنبل ٹپک پڑی۔

''یہ دانش بھائی ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ بڑے ہی باتونی اور حاضر جواب ہیں!''

دانش کا فیصل سے تعارف کراتے ہوئے سنبل رُکی تو فیصل نے بھی بڑی فراخ دلی کے ساتھ اس کی ہتھیلی کو اپنے ہاتھوں میں لے کر زور سے دباتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی!''

''دیکھئے نا، میں تو سہسرام جا رہا تھا، مگر ہڑتالیوں نے راستے میں ہی ٹرین روک دی تو سوچا پلیٹ فارم پر رات گزارنے سے تو اچھا ہے کہ یہیں اُتر کر آپ لوگوں سے مل لیا جائے!''

''چلئے، اچھا ہی ہوا۔ اسی بہانے ملاقات تو ہو گئی!''

''ہاں، شادی کے موقع پر آپ کو دیکھا تھا، اس کے بعد تو ملنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔

لیکن جب بھی سنبل میکے آئی، میں اس سے مل کر آپ کا حال دریافت کرلیا کرتا تھا۔''

''تبھی تو سنبل آپ کے بہت گن گایا کرتی ہے!''

''مجھے بھی بچپن کا زمانہ یاد آتا ہے تو کیسی کیسی یادیں تازہ ہونے لگتی ہیں!''

سب یوں ہی اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ کر بیتے دنوں کی خوبصورت یادوں سے ایک دوسرے کا دل بہلاتے رہے۔ پھر کھانا کھایا اور سو گئے۔ صبح دیر سے نیند ٹوٹی تو ناشتہ تیار تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر دانش نے ریلوے انکوائری کو فون کیا تو پتہ چلا کہ ہڑتال واپس لے لی گئی ہے اور ٹرینوں کا چلنا حسبِ معمول بحال ہو چکا ہے۔ دانش نے اطمینان کی سانس لی اور پھر کبھی آنے کا وعدہ کرتے ہوئے فیصل سے جانے کی اجازت لے لی اور پہلی گاڑی پکڑ کر سہسرام کے لیے روانہ ہو گیا۔

فیصل کے ساتھ سنبل کا بیاہ نہایت شان و شوکت سے ہوا تھا۔ جب دلہن کی ڈولی اس کے پھولوں بھرے آنگن میں اُتری تھی تو اسے پا کر فیصل کو لگا تھا کہ اس کی رنگین اور خوبصورت زندگی میں بھی کسی تلخی یا کمی کا گزر نہیں ہوگا۔ ویسے حالات بھی سازگار تھے۔ زندگی کی ہر خوشی اسے حاصل تھی۔ خوبصورت عمارت، لمبا کوریڈور اور دونوں جانب سجے سجائے کمرے، فرش پر قیمتی قالین، کھڑکیوں پر ہلکے نیلے رنگ کے کاٹن کے پردے۔ کورنر ٹیبل پر رکھا ٹیلی ویژن۔ وہ سنبل کو چاہتا بھی بہت تھا۔ کبھی کسی چیز کی کمی ہونے نہیں دی۔

مگر دانش کے ساتھ تو سنبل کا ایک الگ ہی رشتہ تھا۔ اَنجانا، ان کہا رشتہ۔ جس رشتے کو وہ اب تک کوئی نام نہیں دے سکی تھی۔ دیتی بھی کیا۔ اسے تو اپنی دوستی عزیز تھی، جس میں نہ بناوٹ کا کوئی شائبہ تھا اور نہ کسی طرح کی کوئی کھوٹ۔

اکثر اس کی یادیں سنبل کا دل بہلانے چل آتی تھیں اور بات ہی بات میں اگر اس کا تذکرہ آ گیا تو وہ فیصل کے سامنے بھی اس کے نظریے کی تائید کرنے سے گریز نہیں کرتی اور اس انداز سے اس کا ذکر کرتی کہ فیصل کے دل میں بھی اس کے تئیں اُنسیت سی پیدا ہو جاتی۔

پہلے تو فیصل نے سنبل کی ان باتوں پر کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ لیکن دانش کی ذات میں اس کی بڑھتی دلچسپی دیکھ کر اس کے دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی اور دانش کا وجود اس کی آنکھوں

میں کھٹکنے لگا۔ سنبل کے من میں کوئی کھوٹ ضرور تھی جس نے فیصل اور اس کے درمیان ایک بے نام سی دوری پیدا کر دی تھی اور اس روز تو اس کا شک یقین کی حد کو چھونے لگا جب اس نے اپنے کمرے میں دانش کے گزر کی بو محسوس کی اور نہایت تلخ لہجے میں اس سے پوچھ لیا۔

سنبل نے بھی کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کی اور بڑی بے باکی سے کہہ دیا کہ ''اس سے پہلے بھی وہ آپ سے ملنے یہاں آچکا ہے۔ میرے ساتھ تو اس کی ملاقات محض رسمی تھی۔ آپ کی عدم موجودگی میں اگر آپ کا کوئی مہمان گھر آجائے تو وہ اتنی بد اخلاق تو نہیں کہ اسے چائے کے لیے بھی نہیں پوچھے!''

مگر فیصل کے من میں تو شک نے جڑ پکڑ لی تھی۔ اسے اس کی باتوں پر یقین کیسے آتا؟ ماحول کی اس کڑواہٹ کو دُور کرنے کے لیے اس نے سنبل کو تنبیہ کر دی۔

''دانش کا گھر آنا اسے پسند نہیں۔ اگر آئندہ وہ اس سے ملی تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔''

فیصل کی باتوں کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھ چکی تھی، مگر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ ذرا سی بات کو طول دے کر طوفان کھڑا کرنے سے کیا فائدہ ہے اس نے کوئی گناہ تو نہیں کیا ہے۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہی تھی کہ وہ فیصل سے پوچھے بغیر دانش سے ملتی رہی ہے۔

سنبل اور دانش کوئی اجنبی نہیں تھے۔ دونوں کے درمیان دوستی کی ابتداء کالج کے رومان پرور ماحول میں ہوئی تھی۔ وہیں کی فضاؤں میں بڑھی اور گہری بھی ہوئی۔ مگر نہ کبھی فیصل کے دل میں اسے اپنی شریکِ حیات بنانے کا خیال آیا اور نہ سنبل نے اسے پانے کی اپنے اندر تڑپ محسوس کی۔ بس اپنائیت اور اُنسیت کا ایسا جذبہ تھا کہ کالج چھوڑنے کے بعد بھی ان کے تعلقات دوستانہ اور خوشگوار بنے رہے۔ البتہ شادی کے بعد ان جذبوں میں تھوڑی سرد مہری ضرور آئی، مگر یادوں نے ساتھ نہیں چھوڑا۔

برسوں بعد ایک روز جب دانش کو سنبل کے یہاں رکنا پڑا تو گزرے دنوں کی یادیں ایک دم سے تازہ ہوگئیں۔ دونوں مطمئن تھے کہ زندگی کی الگ الگ راہیں اختیار کرنے کے باوجود ان کی دوستی میں کہیں کوئی بدلاؤ نہیں آیا تھا، مگر فیصل نے اسے جب ٹوکا تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ تو فیصل کی امانت ہے۔ اس نے دوستی کے نام پر دانش کے ساتھ

اپنائیت بڑھا کر خود کو فریب دیا ہے۔ اسے وہ راستہ اختیار ہی نہیں کرنا چاہیے جس کی کوئی منزل نہیں۔ اگر وہ دانش سے دوبارہ ملی تو اس کا ضمیر اسے مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کر دے گا۔

مگر دانش تو سنبل سے ملنے کی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتا تھا، لیکن دو ایک بار جب وہ اس سے ملنے فیصل کے گھر آیا تو نہ سنبل اس کے سامنے آئی اور نہ اس کے سوالوں کا اسے کوئی معقول جواب ملا۔ تب سنبل کی مجبوریاں اس کی سمجھ میں آ گئیں۔ کہیں نہ کہیں کوئی بات ضرور تھی۔ کوئی کمزوری یا کسی بدگمانی کا احساس، جس نے اسے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حالانکہ اس نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ اس کو لے کر سنبل کی ذات پر کوئی انگلی اٹھائے۔ فیصل اور سنبل کے اچھے بھلے تعلقات میں کسی طرح کی دراڑ پیدا ہو۔

رفتہ رفتہ فضاؤں سے گھٹن کے بادل چھٹے اور انجانے خوف کی لہر معدوم ہوئی تو دُور تک راہوں میں نہ کہیں کڑواہٹ کے آثار تھے اور نہ تلخی کی جھلک۔ زندگی کے شب و روز اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ بڑے پُرسکون گزر رہے تھے۔

لیکن اس دن شام کو جب فیصل ذرا دیر سے گھر لوٹا تو ایک روح فرسا منظر کی تلخ حقیقت نے اس کے پور پور میں غصّے کی چنگاری بھر دی۔ اس نے دُور سے ہی دیکھا دانش اس کے گھر سے نکل رہا تھا۔ اس کے دل میں سنبل کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ اس بے شرم و بے حیا کی یہ مجال کہ اس کی غیر موجودگی میں اپنے یار کو گھر بلائے۔ آج وہ اسے اس کی اوقات بتا دے گا۔ اس کے ذہن میں خیالوں کے جھکڑ اس تیزی سے گردش کرنے لگے کہ اسے چکر سا آ گیا اور وہ تیورا کر وہیں سڑک کے کنارے پتھروں کے ڈھیر پر گرا پڑا۔ سر میں سخت چوٹیں آئیں اور پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔

چند ہی لمحے پہلے جب دانش فیصل کے گھر سے نکل کر سڑک پر آیا تھا تو شام چاندنی میں ڈھل کر نکھری ہوئی تھی۔ سڑک پر دُور دُور تک سناٹا پڑا تھا۔ ابھی اس نے کچھ فاصلے طے کیے تھے کہ اچانک اس کا دل دہل اُٹھا اور اس کی چیخ حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ اس نے اپنی نظروں کے سامنے فیصل کو سڑک پر گرتے ہوئے دیکھا اور وہ بے اختیار لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ کئی راہ چلتے لوگ بھی اس کی مدد کو آ چکے تھے۔ اس کی حالت غیر دیکھ کر کسی نے پاس سے گزرتی ہوئی

ایک ٹیکسی کو آواز دے دی اور دانش نے لوگوں کی مدد سے اسے ٹیکسی میں لاد کر ڈرائیور سے اسپتال چلنے کو کہہ دیا۔

اسپتال زیادہ دور نہیں تھا۔ ایمرجنسی وارڈ میں کئی ڈاکٹر ڈیوٹی پر موجود تھے۔ ڈاکٹروں نے اس کے علاج میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور جلد ہی فیصل ہوش میں آ گیا۔ مگر اس کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر نے اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے دانش سے کہا۔

''ویسے تو مریض کی جان کو خطرہ نہیں۔ لیکن جسم کا بہت سارا خون بہہ جانے سے اس کی حالت نازک بنی ہوئی ہے۔ حالت سدھارنے کے لیے خون چڑھانا ضروری ہوگا!''

ڈاکٹر کے لہجے کی اُداسی نے دانش کو ایک دم سے مضطرب اور پریشان کر دیا۔ اب وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کس سے کہے؟ کون دے گا خون؟ وہ سنبل کو اس حادثے کی خبر دینا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے تو وہ اسے اس کی ماں کی موت کی خبر دے کر لوٹا تھا، جسے سن کر سنبل رو پڑی تھی۔ ایسے میں فیصل کا دُکھ برداشت کرنا اس کے لیے کتنا مشکل ہوگا۔ اس نے اپنے ٹوٹے بکھرے جذبوں کو سمیٹتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا۔

''سر! پہلے آپ میرا خون ٹسٹ کر لیں۔ اس کی جان بچانے کے لیے میں اس کے کسی کام آیا تو مجھے بڑی خوشی ہوگی؟''

اتفاق سے دانش کا خون فیصل کے خون سے ٹیلی کر گیا اور ڈاکٹروں کی محنت ٹھکانے لگی۔ کئی گھنٹے بعد جب فیصل کو اسپتال سے جانے کی اجازت ملی تو گھر لوٹتے ہوئے اس کا سر شرمساری کے احساس اور ندامت کے بوجھ سے جھکا ہوا تھا۔ اس نے دانش کو جتنا نیچ سمجھا تھا وہ تو اتنا ہی بڑا انسان دوست نکلا۔

فیصل کے ساتھ یہ حادثہ اتنا اچانک اور غیر متوقع ہوا تھا کہ اِرد گرد کے لوگ کچھ سمجھ بھی نہیں پائے۔ سنبل کو بھی اس حادثے کی خبر بہت دیر سے ملی۔ وہ تو ماں کے غم میں نڈھال بڑی بے صبری سے فیصل کا انتظار کر رہی تھی۔ تبھی کسی نے اسے اس حادثے کی جانکاری دی اور بتایا کہ اس نے لوگوں کو اسے اسپتال کی طرف لے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ شاید وہ کہیں راستے میں کسی تیز رفتار گاڑی سے ٹکرا کر گر پڑا تھا۔ ازراہِ ہمدردی راہ گیروں نے اسے اسپتال پہنچا دیا۔

سنبل دم بخود رہ گئی۔ اس المناک خبر نے اس کے ذہن میں اُتھل پتھل مچادی تھی۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو قابوں میں کیا اور کسی طرح اسپتال جا پہنچی۔ مین گیٹ سے ہو کر جیسے ہی وہ صدر دروازے کی طرف بڑھی، فیصل اور دانش کو ایک ساتھ دروازے کی سیڑھیاں اُترتے دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی اور وہ لپک کر اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ فیصل نے اسے بازوؤں کا سہارا دے کر سنبھال لیا اور دانش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''سنبل تم دانش کا شکریہ ادا کرو کہ ان کی وجہ سے میری جان بچ گئی۔ ورنہ آج یہ نہیں ہوتے تو معلوم نہیں میرا کیا حشر ہوتا!''

اور اس سے پہلے کہ سنبل کچھ بولتی وہ خود ہی بول پڑا۔

''چلو سنبل گھر لوٹ چلیں۔ صبح ماں کے آخری دیدار کے لیے ہم سب ایک ساتھ چلیں گے!''

تینوں ایک ساتھ مین گیٹ پار کر کے سڑک پر آ گئے۔

باہر آسمان پر تیرتے کالے بادل چھٹ چکے تھے اور پورے چاند کی سنہری کرنوں میں ماحول کا رنگ رُوپ بدلا ہوا تھا۔

OO

موت کا سوداگر

راجہ ہوٹل اپنی شاندار عمارت اور اعلیٰ کارکردگی کے لیے پورے شہر میں مشہور تھا۔ گھنی آبادی سے ذرا ہٹ کر دریا کنارے واقع اس ہوٹل میں سینکڑوں مسافروں کے ٹھہرنے کی گنجائش تھی۔ کمرے صاف ستھرے اور ہوادار تھے۔ خوشگوار فضا اور آمدورفت کی سہولتوں نے اسے سیاحوں اور کاروباری لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رکھا تھا۔

اس دن موسم بڑا پُراسرار تھا۔ کبھی بادل گھر آتے اور بارش ہونے لگتی۔ کبھی آسمان صاف ہو جاتا اور دُھوپ نکل آتی۔ ایسے بے تکے موسم میں سفر بڑا تکلیف دِہ ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس روز ہوٹل میں آنے والے مسافروں کی تعداد بہت کم تھی۔

لنچ کے بعد ہوٹل کے استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھا وِنود اخبار دیکھ رہا تھا۔ ابھی اس نے سرخیوں پر نظریں دوڑا کر پہلا پنا پلٹا ہی تھا کہ دو لڑکیاں اندر داخل ہوئیں اور کاؤنٹر پر کہنیاں جمائے اس کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ اس نے ایک اُچٹتی سی نگاہ ان پر ڈالی۔

لڑکیاں بے حد جوان خوبصورت اور پُرکشش تھیں۔ ایک کا رنگ صاف اور قد لمبا تھا۔ دوسری سانولی، مگر اس کے چہرے کے نقوش بڑے تیکھے تھے۔ آنکھوں میں بے انتہا کشش تھی۔ بال سیاہ ریشمی دھاگوں کی طرح چمکدار تھے، جس کی ایک لٹ اس کے ماتھے پر جھول رہی تھی۔

دوسرے ہی لمحے وِنود نے انھیں سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لڑکیاں جب بیٹھ گئیں تو اس نے پوچھا۔

''کہیے میڈم کیا خدمت کروں؟''

''ہمیں دو کمرے چاہئیں!''

''مل جائیں گے۔ ہمارے یہاں سو روپے سے لے کر پانچ سو روپے روز تک کا کمرہ ہے۔ آپ جیسا کہیں دکھا دوں!''

''کمرہ ذرا ڈھنگ کا ہونا چاہیے اور کیا!''

''یوں تو سبھی کمروں کے ساتھ باتھ روم منسلک ہیں، لیکن ڈھائی سو سے اوپر کے کمرے میں فون کی سہولت کے ساتھ ٹیلی ویژن کا بھی انتظام ہے۔''

''ٹھیک ہے آپ ڈھائی سو والے ہی دو کمرے ہمارے نام بک کر دیں!''

''دو کمرے؟'' وِنود کو حیرت ہوئی۔ لڑکیوں کے ساتھ کسی اور کو نہ دیکھ کر پوچھ لیا۔ تب لمبے قد والی نے اپنے پرس سے ڈھائی ہزار کے نوٹ نکالے اور کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں کل تک ہمارے ہسبینڈ بھی آ جائیں گے۔ آپ انھیں جمع کر لیں!''

وِنود نے جواب سے مطمئن ہو کر سامنے پڑے رجسٹر کو کھولا اور اس پر دونوں کے نام و پتے درج کیے۔ گوری رنگت والی کا نام شوبھا تھا اور سانولی پونم تھی۔ دونوں مہاراشٹر کی رہنے والی تھیں اور ایک بڑی دوا ساز کمپنی میں میڈیکل ریپریزنٹیٹو کا کام کرتی تھیں۔

وِنود نے تفصیلات درج کرنے کے بعد رجسٹر پر دونوں کے دستخط لیے پھر پاس کھڑے بیرے کو کمرے کی چابیاں تھما کر بولا۔

''دیکھو میڈم کو ان کے کمرے تک پہنچا دو!''

''جی صاحب!'' بیرے نے جھک کر وِنود کو سلام کیا اور لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے کر اوپری منزل پر چلا گیا، جہاں دونوں کمرے راہ داری کے بالکل آمنے سامنے تھے۔

کمرے انھیں بہت پسند آئے۔ دونوں کمرے ایک جیسے تھے۔ بڑے خوبصورت اور سجے سنوارے۔ سامنے دیوار پر ایک گھڑی لٹک رہی تھی۔ کمرے میں ایک جانب ٹیبل پر رنگین ٹی وی رکھا تھا۔ دوسری طرف صوفے کے سامنے پڑی گول میز پر نئی وضع کے گلدانوں میں تازہ پھول رکھے تھے۔

چند لمحے کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر شوبھا نے کولر کا بٹن دبا کر دیکھا فضاؤں

میں نمی سی چھا گئی۔ تب پونم نے بھی ٹیلی ویژن کا سوئچ آن کر دیا۔ کمرہ موسیقی کی مدھر آوازوں سے گونج اٹھا۔ دونوں مطمئن ہو کر گدّے دار بستر میں دھنس گئیں۔

بیرا بہت خوش مزاج تھا۔ اس کو لڑکیوں کی بے تکلفی بہت پسند آئی۔ اس کی دزدیدہ نگاہیں ان کے جسم ٹٹول رہی تھیں۔ سینے کے اُبھار، کولھے کی گولائیاں، شاداب اور شگفتہ چہرے۔ گالوں پر سیب جیسی لالی نے انھیں بے حد جاذب نظر بنا دیا تھا۔

بیرے نے پُر شوق نگاہوں سے شوبھا کی طرف دیکھا پھر پونم پر نظریں جما کر بولا۔

''جب بھی آپ کو کسی چیز کی ضرورت پڑے بیل دَبا دینا۔ میں آ جاؤں گا۔''

شوبھا کی آنکھیں بولتی تھیں کہ کانوں میں جیسے گیت سے بج اٹھتے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ دیکھ کر پونم نے ایسی انگڑائی لی کہ اس کے بدن کی ساری خوبصورتی بیرے کی آنکھوں میں اُتر گئی۔ پھر اس نے بیرے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے روبرو بٹھا لیا اور بڑی اپنائیت سے بولی۔

''تمھارا نام کیا ہے؟''

''راج کمار۔''

''ونڈرفل۔ تم آدمی تو بہت کام کے لگتے ہو۔ کیا تم ہمارے لیے دو لڑکے کا انتظام نہیں کر سکتے؟''

''کیسا لڑکا چاہیے؟''

''بس تمھاری طرح ہینڈسم ہونا چاہیے۔ بوائے فرینڈ کی طرح۔ جس کے ساتھ رات گزاری جا سکے!''

''اوہ! اب سمجھا لیکن ہمارے یہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا مالکن۔ اگر مالک کو پتہ چل گیا تو ہماری چھٹّی کر دے گا!''

''تم اس کی فکر مت کرو۔ مالک کو بھنک بھی نہیں لگے گی۔ ایک رات کے لیے دو چار سو میں تو ڈھیر سارے نوجوان مل جائیں گے۔ تمھیں تو صرف دو ہی لانے ہیں۔ اس کے لیے ہم تمھیں ایک ہزار الگ سے دیں گے!''

”مگر مالکن برسات کی اس شام میں جبکہ بوندا باندی بھی ہو رہی ہے، ایسے میں باہر سے کسی آدمی کا یہاں لانا ممکن نہیں!“

”لیکن تم کوئی اور صورت تو نکال سکتے ہو!“

بیرا کچھ دیر خاموشی سے سوچتا رہا۔ پھر جیسے کوئی بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ آہستہ سے بولا۔

”آپ کی بات رکھنے کے لیے مجھے تو کچھ کرنا ہی ہوگا۔ ویسے ہمارے گاؤں کا ایک لڑکا ساتھ میں کام کرتا ہے۔ کورا اور کنوارا بھی ہے۔ اگر وہ نائٹ پارٹنر بننے کو تیار ہو گیا تو رات بڑی اچھی گزرے گی!“

”ہمیں تم سے ایسی ہی اُمید تھی۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمھیں پینے پلانے کا بھی شوق ہے؟“

”بس مالکن! کسی نے پیار سے پلا دیا تو پی لیتا ہوں ورنہ خرید کر کبھی نہیں پیتا۔“

”بہت چالاک ہو!“ شوبھا نے پانچ پانچ سو کے دو نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ پھر بولی۔

”دو بوتل وائن کے ساتھ دو پلیٹ چکن بھی لے آنا!“

بیرے نے پہلو بدل کر نوٹ کو مٹھی میں دَبایا۔ اس کی آنکھوں میں ہوس کے ڈورے اُبھر آئے تھے۔ ہونٹوں پر بے نام لذت کی پیاس جھلک رہی تھی۔ اس نے باہر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے تاکید کر دی۔

”مگر مالکن کواڑ کھلا رکھنا۔ کہیں آنے میں دیر ہوئی تو دروازہ تھپتھپانا نہ پڑے!“ اس سے پہلے کہ شوبھا اسے کوئی جواب دیتی۔ وہ رنگین خیالوں میں کھویا کمرے سے نکل گیا۔

رات جب گہری تاریک ہوگئی۔ سناٹے ہوٹل کے گرد منڈلانے لگے اور منیجر نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تو بیرا اپنے نوجوان ساتھی کو لے کر ان کے کمرے میں پہنچ گیا۔

کچھ دیر تک تو سب ساتھ بیٹھے بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ پھر باتوں میں مٹھاس گھل گئی اور ماحول رنگین بن گیا تو شوبھا کی انگلیاں ٹیلی ویژن کے سوئچ پر جم گئیں۔ گیت بج

اٹھا۔ فضاؤں میں نغمے بکھر گئے۔

تب پونم نے بوتل کا کارک کھولا اور پیگ بنانے بیٹھ گئی۔ جام سے جام ٹکرانے لگے۔ لڑکیاں پینے پلانے کا ہنر جانتی تھیں۔ کبھی شوبھا نے چسکی دو چسکی لے کر گلاس بیرے کے ہونٹوں سے لگائی تو کبھی پونم نے قطرے دو قطرے منہ میں ٹپکا کر گلاس بیرے کے ہاتھوں میں تھما دیا اور انھیں پینے پر مجبور کرتی رہی۔

جب بیرے پی کر مدہوش ہو گئے، فضاؤں میں کیف و مستی کی گھٹائیں چھا گئیں اور سب کچھ نشہ میں ڈوب گیا تو دونوں انھیں بازوؤں میں سنبھالے بستروں پر چلی گئیں اور اندر سے دروازے بند کر لیے۔

صبح جب لڑکیاں فریش ہو کر نکلیں تو راہ داری سے گزرتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے کاؤنٹر پر رُکیں اور شوبھا نے کلرک سے ناشتہ کے لیے کہہ دیا۔

''جب تک ہم لوگ نیچے سے ہو کر آتے ہیں تب تک ناشتہ تیاّر ہو جانا چاہیے۔ آج ہم لوگ چکن کے ساتھ پراٹھا لیں گے!''

شوبھا کی آواز میں بڑی نغمگی تھی۔ دیر تک فضاؤں میں گیت سے لہراتے رہے۔ وِنود کو شوبھا اور پونم کے کھلے ہوئے چہرے بے حد تازہ اور شگفتہ لگے۔ کانوں میں جھولتے ہوئے سنہرے آویزے ان کے گالوں کو دمکا رہے تھے۔ وہ مسحور ہو کر انھیں تکتا رہ گیا اور شوبھا پونم سے باتیں کرتی دھیرے دھیرے سیڑھیاں اُتر گئی۔ باہر کچھ ہی فاصلے پر ایک کار کھڑی تھی، جس کا بونٹ کھولے ڈرائیور مشین پر جھکا تھا۔ لڑکیوں کو قریب آتے دیکھ کر اس نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور خود ڈرائیورنگ سیٹ سنبھال لی۔

کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی جب لڑکیاں واپس نہیں لوٹیں تو کاؤنٹر پر بیٹھا ادھیڑ عمر کا وِنود سوچ میں پڑ گیا۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا رہا، اس کے اندیشے بھی بڑھتے گئے۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اور اس نے راج کمار کو آواز دی جسے چابیاں دے کر اس نے لڑکیوں کو ان کے کمرے میں پہنچانے کو کہا تھا، مگر وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ تب وہ اسے ڈھونڈتا ہوا شوبھا کے کمرے تک آیا۔ مگر سنسان راہ داری کے دونوں جانب کمرے بند تھے۔ صرف پچھلی

کھڑکیاں کھلی تھیں، جہاں سامنے سے گزرنے والی سڑکیں دُور تک دکھائی دیتی تھیں اور باہر دروازوں پر تالے لٹک رہے تھے۔

بات پھیلتے دیر نہ لگی۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے، مگر معاملہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ سب خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کو تکتے رہے جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ منیجر بھی بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ جلدی جلدی تالے کھلوائے گئے۔

جوں ہی منیجر نے کمرے میں قدم رکھا اس کے ہوش اُڑ گئے۔ اندر کا منظر بڑا بھیانک تھا۔ بیرے بستروں پر مردہ پڑے تھے اور ان کے کھلے ہوئے پیٹ میں گردے کا کہیں پتہ نہ تھا۔

OO

سازش

وہ لمحہ میری زندگی کا سب سے کربناک اور درد انگیز تھا۔ جب موت میرے گرد گھیرا ڈالے اپنا دائرہ تنگ کر رہی تھی۔

کئی دنوں سے پورا شہر فساد کی آگ میں جل رہا تھا۔ شعلے آسمان کو چھو رہے تھے اور لپٹیں اتنی بھیانک اور تیز اٹھ رہی تھیں کہ آس پاس کے کئی گاؤں اس کی لپیٹ میں آ چکے تھے۔ ہر طرف افراتفری مچی تھی۔ کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں تھا۔ ایسے میں کسی اُجڑے اور لٹے لٹائے گھرانے کی فکر کسے ہوتی؟ کس کو اتنی فرصت تھی جو تباہ حال لوگوں کے زخموں پر مرہم کے پھاہے رکھتا؟ سب دھرم کے نام پر لڑتے رہے۔ ناحق آدمی کا خون سڑکوں پر بہتا رہا۔ ندی نالے اور کھیتوں میں پڑی لاشیں نوچتے اور کھاتے جنگلی جانوروں کے من بھی اُوب گئے۔

قتل و خوں ریزی کی اس بے موسم برسات نے نہ جانے کتنی جانیں لے لیں پھر بھی اس کا زور کچھ کم نہیں ہوا۔ فلک شگاف نعروں کے بیچ تڑپتی اور دم توڑتی آہیں ماحول کو بے حد خوفناک اور دہشت زدہ بنائے ہوئے تھیں۔

میں چھت کے اوپر ریلنگ کی اوٹ میں دُبکا نہ جانے کب سے موت کا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ زندگی داؤ پر لگی تھی اور خوف کے مارے بدن کے سارے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔

یوں تو فساد کے لیے فضا کئی دنوں سے تیار کی جا رہی تھی۔ ہر طرف ایک انجانا سا خطرہ منڈلا رہا تھا اور ڈرے سہمے لوگ جان بچانے کی خاطر گھروں کو چھوڑ کر محفوظ مقامات کی طرف بھاگ رہے تھے۔ مگر کچھ لوگ جنھوں نے بستی چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا اپنے گھروں میں صرف اس خیال سے جمے رہے کہ فساد ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ٹل جائے گا۔

مگر فساد ٹلا نہیں۔ جب ایک مذہبی جلوس پر شرپسندوں کے فرضی حملوں کو بہانہ بنا کر مٹھی بھر لوگوں نے ہنگامے کی ابتدا کردی تو فرقہ پرستوں کو بھی موقع مل گیا اور وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سڑکوں پر اُتر آئے اور لوٹ کھسوٹ کا بازار ہو گیا۔ شام تک جب صورتِ حال قابو سے باہر ہو گئی تو انتظامیہ نے پورے شہر میں کرفیو نافذ کر کے فسادیوں کو دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم صادر کر دیا۔

کرفیو کی خبر سنتے ہی لوگ گھروں میں دُبک گئے۔ کسی کی کھوج خبر لینا تو درکنار، کھڑکیوں سے جھانکنا بھی آدمی کے لیے خطرے سے خالی نہیں رہا۔ سڑکیں سونی اور گلیاں ویران ہو گئیں۔ بازاروں میں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔

مگر ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن پر کرفیو کی سخت پابندیوں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا اور ان کی مجرمانہ سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شاید انھیں قتل و غارت گری کی چھوٹ ملی ہوئی تھی۔

وہ رات بھر کرفیو کے دوران پاس کی ایک بستی کو لوٹتے رہے۔ جب بستی کھنڈر بن گئی تو شرپسندوں نے تازہ دم ہو کر ہمارے گاؤں پر حملہ بول دیا۔

میرا گھر فسادیوں کے نرغے میں تھا اور آس پاس کے مکان جل رہے تھے۔ فضاؤں میں چنگاریاں سی اُڑ رہی تھیں اور میں پسینے میں شرابور چھت پر کھڑا اپنی سلامتی کی دُعائیں مانگ رہا تھا۔

اچانک پچھلے دروازے کی کنڈی کھڑک اٹھی اور پھر تھوڑے سے توقف کے بعد دوبارہ دھیرے دھیرے بجنے لگی۔ میں نے سمجھ لیا کہ موت کی یہ دستک اب مجھے یہاں سے لے کر ہی ٹلے گی۔ آنے والے خطرے سے نمٹنے کے لیے میں نے خود کو تیار کر لیا اور دبے پاؤں دروازے کے پاس پہنچ کر جھروکے سے آنکھیں لگا دیں۔

میری آہٹ پا کر دروازے پر کھڑے ایک شخص نے ہولے سے مجھے پکارا۔ اس کی جانی پہچانی آواز سن کر میں نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔ وہ میرے گھر کے قریب ہی ایک بڑے مکان میں رہتا تھا۔ اس سے میرے اچھے تعلقات تھے۔ مجھ پر نظر

پڑتے ہی اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس نے دُکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔ ’’تم نے اب تک گھر کیوں نہیں چھوڑا۔ کسی محفوظ مقام پر چلے گئے ہوتے۔ دیکھتے نہیں شہر کی حالت کتنی خراب ہو چکی ہے!‘‘

’’تمھارا کہنا درست ہے۔ یہی سوچ کر تو میں نے بال بچوں کو ہٹا دیا تھا کہ دو ایک روز میں گھر خالی کر خود بھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مگر آناً فاناً صورتِ حال ایسی خراب ہو گئی کہ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا!‘‘

’’دیکھو غنڈے بستی میں داخل ہو چکے ہیں۔ میں تمھیں لینے آیا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو، جب تک حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے میرے یہاں رہنا!‘‘

’’مگر یہاں سے نکلا کیسے جائے۔ ہر جگہ تو کرفیو لگا ہے!‘‘

’’کرفیو تو صرف تمھارے واسطے ہے۔ غنڈوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ چلو جلدی کرو۔ پچھواڑے والی گلی اب بھی محفوظ ہے۔ ہم آسانی سے نکل جائیں گے اور کسی کو کچھ پتہ بھی نہیں چلے گا۔‘‘

اس کی بات مجھے اچھی لگی اور میں اس کے ساتھ جانے کو تیاّر ہو گیا۔ وہ بڑی احتیاط سے مجھے لے کر وہاں سے نکلا۔ ہم ایک تنگ گلی سے ہو کر گزرے۔ لرزتے قدموں سے سڑک کو عبور کیا اور کسی طرح اس کے گھر پہنچ گئے۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے بھی یک گونہ سکون ملا۔

اس نے اوپر کے ایک کمرے میں میرے لیے جگہ بنائی۔ ہم ایک ہی بستر پر بیٹھے کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ فساد کا ہولناک منظر نگاہوں میں گھومتا رہا۔ اچانک اس نے میری صورت دیکھی اور میری کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے اسے جیسے کچھ یاد آ گیا۔ اس نے ایک بات مجھ سے پوچھ لی۔

’’کوئی قیمتی سامان گھر میں رہ تو نہیں گیا؟‘‘

’’سونے کے زیور اور چاندی کے برتن تو میں نے آنگن کی دہلیز کے نیچے دبا دیا ہے۔ باقی کسی سامان کو ہٹانے کی مہلت ہی کہاں ملی!‘‘

میرے جواب سے تھوڑا مطمئن ہو کر اس نے خاموشی اختیار کر لی اور ہم چپ چاپ بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔ انسانی جان و مال کی یہ تباہی ہمارے دل و دماغ پر گہرے اثر ڈال رہی تھی۔

میں کئی گلاس پانی حلق میں اُنڈیل کر گھر سے نکلا تھا، مگر پیاس تھی کہ بجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں نے اس سے پانی مانگا تو وہ میرے لیے چائے ناشتہ لانے نیچے چلا گیا۔

کئی لمحے گزر گئے۔ انتظار کا تو ایک پل بھی صدیوں پر بھاری ہوتا ہے۔ تنہائی مجھے ڈسنے لگی۔ وسوسوں نے آ گھیرا اور میرا من ڈولنے لگا۔

اسی لمحے ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آیا اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھل گئے۔ میری روح کانپ گئی۔ ہر سو خطرہ منڈلا رہا تھا۔ کہیں کوئی میری بُو نہ پالے۔ میں خود کو لوگوں کی نظروں سے بچانے کے لیے کھڑکی بند کرنے کے ارادے سے اٹھا، لیکن پلاّ چھوتے ہی باہر کے نظاّرے نے میرے ہاتھ پاؤں شل کر دیئے۔

غنڈے اب میرے گھر کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ ہتھیاروں سے لیس جوانوں کی ایک ٹولی کے آتے ہی ان میں ایک نیا جوش بھر گیا اور وہ بے قابو ہو کر دروازے اور کھڑکیوں پر ٹوٹ پڑے۔ پل بھر میں سب کچھ توڑ پھوڑ ڈالا اور اندر گھس کر لوٹ مچانے لگے۔

پہلے قیمتی سامانوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر جس کے جو ہاتھ لگا وہی لے کر چلتا بنا۔ جب گھر کی ایک ایک فالتو چیز بھی اُٹھ گئی تو جاتے ہوئے کئی لوگوں نے پٹرول چھڑک کر گھر کو آگ لگا دی۔ ایک تیز شعلہ سا لپکا اور میں نے خوف سے آنکھیں موند لیں۔

اسی لمحے دھوتی کا ایک پھندہ میری گردن میں آ گرا۔ مجھے موقع کی نزاکت سمجھتے دیر نہیں لگی۔ اس سے پہلے کہ پھندے کی گرفت سخت ہوتی میں نے چاہا کہ اسے مضبوطی سے تھام لوں، مگر پل بھر میں اس کا دائرہ اتنا تنگ اور گرہ ایسی سخت پڑ گئی کہ میں کچھ بھی نہیں کر سکا۔ کچھ بھی نہیں!!

OO

کانٹے بن گئے پھول

بعض اوقات آدمی کے لیے خود کو سنبھالے رکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ پیٹ کی مار اور چوٹ کا درد تو لوگ کسی طرح برداشت کر لیتے ہیں مگر جسم کی پیاس کو سہ لینا سب کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

شیلا ایک عرصہ تک اپنے آپ سے جوجھتی رہی۔ اندر ہی اندر ٹوٹتی اور بکھرتی رہی۔ تب جا کر اسے زندگی کا مفہوم سمجھ میں آیا کہ مرد کے بغیر عورت کی زندگی نامکمل ہے اور ایک دن شیلا نے سکھ رام کے ہاتھ تھام کر خود کو اندھیرے میں بھٹکنے سے بچالیا اور شادی کے بعد دونوں ایک ساتھ رہنے لگے۔

شیلا کی شادی جب رام دیو سے ہوئی تھی تب یہ کسی نے کہاں جانا تھا کہ رام دیو کی عمر وفا نہیں کرے گی اور وہ اتنی جلد لوگوں کو داغ مفارقت دے جائے گا۔ رام دیو یونیورسٹی کے اکزامینیشن ڈیپارٹمنٹ میں کلرک تھا اور اپنی محنت و لگن کی بدولت ترقی پا کر پچھلے ایک سال سے ہیڈ کلرک کے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ ان کے دو بچّے تھے۔ بڑا پون دلّی کے ایک بورڈنگ اسکول میں پڑھتا تھا اور چھوٹا راج کمار، اس نے شہر کے ہی ایک کانوینٹ اسکول میں نیا نیا داخلہ لیا تھا۔

رام دیو جتنا روشن خیال تھا اس کی ازدواجی زندگی بھی اتنی ہی خوشگوار تھی۔ زندگی کے دن بڑی راحت سے گزر رہے تھے کہ ایک روز رام دیو یونیورسٹی کے کسی کام سے کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں ایک جگہ بس پل کی ریلنگ کو توڑ کر نہر میں جا گری۔ حادثہ بڑا سنگین تھا۔ بیشتر مسافروں کی تو بس کے اندر ہی دم گھٹنے سے موت ہوگئی، اور باقی زخمیوں کو پاس کے صدر

اسپتال میں بھرتی کرایا گیا۔ مگر رام دیو نے اسپتال جاتے ہوئے زخموں کی تاب نہ لا کر راستے میں ہی دم توڑ دیا۔

رام دیو کی موت نے شیلا کی زندگی اجاڑ کر رکھ دی۔ اس کے وجود میں اپنی یادوں کی کیلیں ٹھونک کر اسے تڑپنے کو چھوڑ دیا۔ بچّے بے سہارا نظر آنے لگے اور ان کے مستقبل کی فکر اسے ستانے لگی۔

رام دیو کا حاکم بڑا نرم مزاج اور انسان دوست تھا۔ پُرسے میں جب اس کے گھر آیا تو اس نے شیلا کی بڑی ڈھارس بندھائی اور اس کی ذاتی دلچسپی کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ وقت پر اسے معاوضہ مل گیا اور وہ اسی دفتر میں کام بھی کرنے لگی۔

نوکری نے شیلا کی نڈھال زندگی میں ایک نئی اُمنگ پیدا کر دی۔ سکھ رام نے بھی اسے بہت سہارا دیا۔ وہ اس کے ساتھ ہی دفتر میں کام کرتا تھا۔ اس کی کبھی رام دیو سے بڑی گہری دوستی تھی۔ سکھ رام پر اس کے بہت احسان تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شیلا سے اس کی اُنسیت بہت بڑھ گئی اور وہ دفتر کے علاوہ اس کے گھریلو معاملات میں بھی دلچسپی لینے لگا۔

شیلا اس کی بے حد شکر گزار تھی کہ سکھ رام نے اسے جینے کا جو حوصلہ بخشا ہے اور اس کے ارادوں کو جو مضبوطی دی ہے، ان سے وہ زمانے کی سختیوں کا مقابلہ تو کر ہی سکتی ہے، زندگی کے اندھیروں کو مٹا کر اپنی گزرگاہوں کو روشن کرنا بھی اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔

سکھ رام کی زندگی میں سکھ تو بہت تھے، مگر ایک بھاری دُکھ بھی تھا، جو دیمک کی طرح اس کی خوشیوں کو چاٹے جا رہا تھا اور زندگی اُلجھنوں کا شکار بن کر رہ گئی تھی۔ بیوی کا برتاؤ اس کے ساتھ کبھی دوستانہ نہیں رہا۔ اس کی خصلت ہی کچھ ایسی تھی کہ شہر کی فضا اسے کبھی راس نہیں آئی۔ پانی کا اثر تھا یا کوئی اور بات۔ میکے سے آتے ہی بیمار پڑ جاتی اور گاؤں جانے کا اسے بہانہ مل جاتا، اور تنہائی کے یہ لمبے طویل ہو کر ان کے درمیان کی دُوریاں بڑھانے کا سبب بن رہے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شیلا کی اپنائیت نے اس کی آنکھوں میں کئی سپنے جگا دیئے اور سکھ رام اسی کا ہو کر رہ گیا۔ شیلا کو بھی سکھ رام کی قربت اچھی لگنے لگی اور وہ اس کی میٹھی باتوں میں اپنے لیے سکھ کے لمحے تلاش کرنے لگی۔

وقت کا تقاضہ تھا اور عمر کی کچھ مجبوریاں بھی کہ دونوں ایک دوسرے کے ہمراز اور ہمنوا بن گئے اور جلد ہی دونوں نے ایک ہو جانے کا فیصلہ کرلیا۔ تبھی ایک روز باتوں ہی باتوں میں سکھ رام نے شیلا سے کہا۔

''تمھیں پون کے کانوں میں بھی یہ بات ڈال دینی چاہیے!''

''میں اپنا اچھا برا سب سمجھتی ہوں۔ پون تو ہوش سنبھالتے ہی پڑھنے کو بورڈنگ اسکول چلا گیا۔ وہ کیا جانے ماں باپ کا پیار۔ ویسے تم کہتے ہو تو میں مل لیتی ہوں!''

حالانکہ شیلا اس بات کو اچھی طرح جانتی تھی کہ پون عمر کا تو کچا ہے، مگر شعور کا بہت پختہ ہے۔ وہ ماں کے ساتھ اس کی دوستی کو پسند نہیں کرتا۔ سکھ رام کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ناراضگی کے آثار اُبھر آتے ہیں۔ وہ اس سے بولنا تک گوارہ نہیں کرتا۔

سکھ رام نے بھی اس کے اُکھڑے پن کو محسوس کیا تھا اور اس کا اندازہ غلط بھی نہیں تھا۔ پچھلی بار گرمی کی چھٹیوں میں جب وہ گھر آیا تھا تو ایک روز سکھ رام کو اپنے یہاں دیکھ کر اس کی بھنویں تن گئی تھیں۔ مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ نہ ماں سے بات کی اور نہ سکھ رام کی کسی بات کا جواب دیا۔ بس بیزار اور دل شکستہ سا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ نہ کہیں آنے جانے کی چاہ اور نہ دوست یار سے ملنے کا کچھ خیال۔ چھٹی پوری بھی نہیں کی اور اُچاٹ سا من لیے چلا گیا۔ شیلا روکتی رہ گئی مگر وہ نہیں مانا۔ اس کے باوجود سکھ رام کے کہنے پر وہ پون کو منانے چلی گئی۔

شیلا کو دیکھ کر پون کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں اُبھرا۔ اس کے سپاٹ چہرے کی بے رُخی نے اس سے بہت کچھ کہہ دیا پھر بھی کھانے کی میز پر اس نے پون سے پوچھ لیا۔

''تم مجھے غلط مت سمجھو پون۔ ایک تنہا عورت کا اکیلے گھر میں رہنا مشکل ہوتا ہے۔ لوگ اسے معیوب سمجھتے ہیں اور میں نے جس شخص کو چنا ہے وہ کوئی بُرا آدمی نہیں۔ اسے میرے سکھ دُکھ سے زیادہ تمھارے مستقبل کی فکر ہے!''

''اس معاملے میں مجھے مت گھسیٹو ماں!''

''تمھارے بنا یہ شادی اچھی نہیں لگے گی!''

''تو میں کیا کروں؟''

''اس موقع پر تمھاری موجودگی سے میرے من کو شانتی ملے گی!''

''تمھارا جو جی چاہے کرو ماں، مگر میرے دل میں باپ کا جو مقام ہے، وہ رتبہ میں کسی اور کو نہیں دے سکتا!''

پون کھانا ادھورا چھوڑ کر ہی اُٹھ گیا۔ ماں نے بھی ہاتھ روک لیے اور جوٹھے برتن سمیٹ کر رسوئی میں رکھ آئی۔ شیلا اس کے دل میں آئے میل کو دھو نہیں سکی اور دوسرے ہی دن دل برداشتہ مایوس اور نامرادسی گھر لوٹ آئی۔

اس سے پہلے بھی اس نے پون کو کئی خطوط لکھے تھے، مگر پون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ویسے بھی وہ خط کم ہی لکھتا تھا، جب سے اس کے من میں گرہ پڑی تھی، پون نے جواب دینا بھی بند کر دیا تھا۔ مگر شیلا کبھی اس کی طرف سے غافل نہیں رہی اور بڑی پابندی سے اس کی پڑھائی کے سارے اِخراجات بھیجتی رہی۔

مگر اس روز جب اس کی شادی کو محض چند دن رہ گئے تھے تو اچانک پون نے آ کر اس کی پریشانیوں میں اضافہ کر دیا۔

شیلا کمرے میں بیٹھی بال سنوار رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے کواڑ کھول کر باہر جھانکا تو خوف کی ایک لہرسی اس کے سارے وجود میں دوڑ گئی۔ من میں کھٹکا سا پیدا ہو گیا کہ کہیں وہ اپنی ناراضگی جتانے تو نہیں آ گیا۔ اگر اس موقع پر وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھا تو ہماری کتنی سبکی ہوگی۔

شیلا خود کو سنبھال بھی نہیں پائی تھی کہ پون نے جھک کر اس کے پاؤں چھوئے اور اندر آ گیا۔ شیلا بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی آئی۔ اس کے ہاتھ سے اٹیچی لے کر ٹیبل پر رکھ دیا اور پوچھ بیٹھی۔

''کیسے ہو پون؟''

''ٹھیک ہوں!''

''تم نے اپنے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ میں لینے اسٹیشن آ جاتی۔''

''کون سی نئی جگہ تھی میرے لیے جو تمھیں تکلیف دیتا!''

''ٹھیک ہے تم ہاتھ منہ دھولو۔ میں ناشتہ لے کر آتی ہوں!'' شیلا صابن اور تولیہ اس کے ہاتھوں میں تھما کر بولی اور رسوئی میں لوٹ کر ناشتہ تیاّر کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ہی پون جب فریش ہو کر ہاتھ روم سے نکلا تو شیلا ناشتہ لے کر اس کے کمرے میں آ گئی۔ ایک عرصہ بعد آج پون کو ماں کے ہاتھوں کا بنا من پسند حلوہ کھانے کو ملا تھا۔ اس نے بڑے چاؤ سے کھایا اور ماں کے اصرار پر تھوڑی سی نمکین بھی لے لی اور چائے میں تو اس نے ماں کو بھی شامل کر لیا اور دونوں اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگ گئے۔

تبھی دروازے کی کال بیل پر کسی نے انگلی رکھ دی۔ پون نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور سامنے سکھ رام کو دیکھ کر ایک عجیب کشمکش میں پڑ گیا۔ سکھ رام کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ پون نے اس کے ذہن میں کئی اندیشے جگا دیئے تھے۔

شیلا خاموش بت بنی بیٹھی رہی۔ وقت جیسے ٹھہر گیا۔ اس کی کھلی آنکھیں کبھی سکھ رام اور کبھی پون کے چہرے کا طواف کرتی رہیں۔

اچانک پون کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ جلدی سے اس نے اٹیچی کھولی اور کپڑے کے دو بنڈل نکالے۔ ایک سکھ رام کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ رہا شادی کا تحفہ! آپ کے لیے سوٹ لایا ہوں!''

فرطِ جذبات میں سکھ رام کے ہونٹ کانپنے لگے اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، پون نے دوسرا پیکٹ ماں کی طرف بڑھا دیا۔

''دیکھو ماں! کیسی خوبصورت ساڑی لایا ہوں۔ تم پر خوب کھلے گی!''

اپنائیت کے اس جذبے سے مغلوب ہو کر دونوں کی آنکھیں چھلک پڑیں اور پون بھی آبدیدہ ہو گیا۔

OO

اجتناب

برسات کی پہلی بارش کے ساتھ ہی پورے شہر میں یہ بات پھیل گئی کہ کوتوالی کے سامنے جوتکونا پارک ہے، اس میں بھگوان شنکر زمین پھاڑ کر وارد ہوئے ہیں۔

بات بڑی دلچسپ، پُراسرار اور چونکا دینے والی تھی۔ جس نے جہاں سنا اس نے وہیں اپنے راستے بدل لیے اور بے اختیار اس سمت چل پڑا جدھر سے اس واقعہ کی ہر کڑی جڑی ہوئی تھی۔ کیا مرد، کیا عورتیں، بچّے، بوڑھے، قطار در قطار، کوئی پیدل چل رہا تھا تو کوئی گاڑی میں سوار۔ دھوپ اُگتے اُگتے لوگوں کی بھاری بھیڑ پارک میں جمع ہوگئی۔

کہتے ہیں کہ ایک رات بھگوان شنکر پولیس کپتان کنول کے خواب میں آئے تھے اور ان کی پوجا ارچنا سے خوش ہو کر انھیں بشارت دی تھی کہ شہر میں تمھارے ہاتھوں ایک عالیشان مندر کا نرمان ہوگا، جس سے تمھاری شہرت دُور دُور تک پھیلے گی اور تم سدا یاد کیے جاتے رہو گے۔ برسوں پہلے جب کنول بھاگلپور میں ڈی ایس پی کے عہدے پر مامور تھے تو انھوں نے ایک فرض شناش پولیس افسر کے طور پر اپنی پہچان بنائی تھی۔ بڑے ہی سیکولر مزاج آدمی تھے۔ علاقے میں امن چین اور سماجی مساوات کی فضا قائم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا اور جلد ہی ان کا شمار گنے چنے چند باصلاحیت پولیس افسروں میں ہونے لگا۔

لیکن اس بار ترقی پا کر جب وہ پولیس کپتان کی حیثیت سے دوبارہ بھاگلپور آئے تو ان کا مزاج بہت بدلا ہوا تھا۔ ان کے سخت رویّے میں نرمی آ گئی تھی اور لہجے میں انسانیت کا درد اُبھر آیا تھا۔ وہ دھرم کے کاموں میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے۔

ابھی انھیں بھاگلپور شہر آئے کچھ ہی مہینے گزرے تھے کہ ایک صبح اچانک ہی بھگوان شنکر نے پارک میں ظاہر ہو کر اس کی مٹی کو متبرک بنا دیا اور خود لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔

شہر کے اُتری کنارے پر گھنی آبادی کے بیچ ٹھیک کوتوالی کے سامنے ایک تکونا سا پارک تھا۔ وقت کی دھول میں اَٹ کر اس کی چمک دمک صرف ماند ہی نہیں پڑی تھی بلکہ وہ اپنی قدر ومنزلت بھی کھو چکا تھا کہ اچانک بھگوان شنکر کے نمودار ہونے سے پارک کی قسمت جاگ اُٹھی اور ماحول کی دلکشی میں بھی اضافہ ہو گیا۔

بھگوان شنکر کے پرکٹ ہوتے ہی آس پاس کے لوگوں میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور جشن کا سا ماحول بن گیا۔ پورے پارک کو کاغذ کے پھولوں اور خوشنما رنگ کی جھنڈیوں سے سجا کر جا بجا راستوں پر گیروا رنگ کے بینر لٹکا دیئے گئے، جس پر مندر کی تعمیر کے لیے چندے کی اپیلیں درج تھیں، جو دُور سے ہی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔

صدر دروازے کے پاس پڑے ٹیبل پر ایک بڑی سی دان پیٹی رکھی ہوئی تھی، جس کے پاس کیسریا رنگ میں ملبوس لمبی جٹاؤں والے ایک مہاپرش کھڑے مائک پر لوگوں سے مندر نرمان کے لیے چندہ دینے کی اپیلیں کر رہے تھے۔ ان کی اپیلوں کا لوگوں پر بڑا اچھا اثر پڑ رہا تھا اور لوگ جی کھول کر دان دے رہے تھے۔ کوئی نوٹوں کی بوچھار کر رہا تھا تو کوئی سکوں کی بارش۔ عورتیں بھی اس کارِثواب میں مردوں سے پیچھے نہیں رہی تھیں۔ کسی دوشیزہ نے کانوں کی بالیاں دے دیں تو کسی عورت نے اپنے ہاتھوں کے کنگن تک اُتار کر بکس میں ڈال دیئے۔

بھگوان شنکر جس جگہ براجمان ہوئے تھے وہاں پارک کے اوپر ایک بڑا سا شامیانہ ڈال دیا گیا تھا، جس میں بھگوان کے درشن کے لیے عقیدت مندوں کی بھیڑ اُمنڈ پڑی تھی اور لوگ پھول مالائیں اور دُھوپ اگربتی دِکھا کر ان کی پوجا ارچنا کر رہے تھے اور منتیں مانگ رہے تھے۔ بھجن کرتن نے پورے ماحول کو سحر آگیں بنا رکھا تھا۔

اس سے ذرا ہٹ کر پشت کی جانب گوشہ میں ایک بڑا سا تمبو ڈالا ہوا تھا، جس کے نیچے فرش پر دری بچھی تھی اور درمیان میں ایک عمدہ قالین پڑا تھا، جس پر علاقے کی کئی خوش پوش اور جانی مانی ہستیاں بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھیں، جن سے صلاح ومشورے کے بعد ہی کپتان کنول نے ایک مندر نرمان سمیتی بنائی تھی اور اپنے کارندوں کی ایک فہرست بھی تیار کر رکھی تھی۔

سمیتی والوں نے کچھ کارندوں کو سیٹھ ساہوکاروں سے چندہ وصولنے کے لیے شہر بھیج

دیا تھا۔ کچھ رضا کاروں نے بازاروں کی کمان سنبھال لی تھی اور کچھ گاؤں گاؤں جا کر چندہ وصولنے میں لگ گئے تھے۔

لوگ بھگوان کے درشن کو ٹوٹ پڑے تھے اور ان میں بھاری جوش وخروش تھا۔ ہر طرف چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ بیڑی سگریٹ بیچنے والے بھی اپنی دکانیں سجائے بیٹھے تھے۔ چھولے اور مونگ پھلیاں بیچنے والوں کا شوروغل بھی سنائی دے رہا تھا۔ چائے پان کی دُکانوں پر بھی گاہکوں کی بھیڑ تھی۔

پارک کے ماحول کو خوش گوار بنائے رکھنے اور لوگوں کو بھگوان کے درشن کی سہولت مہیّا کرانے میں سمیتی کے رضا کار بڑی مستعدی اور نرم دلی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ پورے شہر میں بھگوان شنکر کے نام کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ ساتھ ہی افواہوں کا بازار بھی گرم تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ لوگوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر پیسہ کمانے کا یہ ایک آسان ہتھکنڈہ ہے۔ کوئی اسے زمین ہتھیانے کی سازش قرار دے رہا تھا۔ ان کی دلیل تھی کہ جس زمین، مکان یا عبادت گاہ کو متنازعہ بنانا ہو، اس کے کسی حصے میں ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا کر اس پر کوئی مورتی بٹھادو۔ پھر کسی کی کیا مجال کہ کوئی اسے وہاں سے بے دخل کر دے۔ یہاں دھرم سے لوگوں کو بڑا پیار ہے۔ وہ کسی قیمت پر اپنے دیوتا کی مخالفت برداشت نہیں کر سکتے اور یہاں معاملہ تو لوگوں کی عقیدت سے جڑا تھا اور سبھی اسے بھگوان کی لیلا مان کر پوجا کر رہے تھے۔

شام تک درشن کرنے والوں کا ایک تانتا سا لگا رہا۔ کئی دان پیٹیاں پیسوں سے بھر گئیں۔ چڑھاوے میں سونے اور چاندی کے زیورات بھی آئے اور اتنی رقم اکٹھی ہوگئی کہ مندر کی تعمیر کا کام آسان ہوگیا۔

درجنوں کاریگر اور مزدور ایک ماہر انجینئر کی نگرانی میں شب و روز کام کرتے رہے۔ علاقے کے نوجوانوں نے بھی رضا کارانہ طور پر خود کو اس کارِ خیر میں شامل کرلیا اور وہ ان کے دوش بدوش کام کرنے لگے۔

رفتہ رفتہ جب مندر کی دیواریں اوپر اٹھیں تو سمیتی والوں کا دھیان مندر کے آس پاس کی بے مصرف زمینوں کی طرف چلا گیا جہاں اچھی خاصی جگہ تھی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ اگر اس جگہ دکانیں بنادی جائیں تو بڑا فائدہ ہوگا۔ اس سے نہ صرف مندر کی خوبصورتی بڑھے گی

بلکہ مندر کی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ بھی نکل آئے گا۔

مشورہ بڑا نیک اور قابلِ عمل تھا۔ سمیتی والے سرگرم عمل ہو گئے اور پورے پارک کی گھیرا بندی کر دی گئی۔ پھر پجاریوں کے رہنے کے لیے دو کمرے اور ایک لمبے صحن کی بنیاد رکھ کر دکانوں کی نیو بھی ڈال دی گئی۔

پارک کا علاقہ تو پہلے سے ہی تجارت کے لیے مشہور تھا۔ لب سڑک نئی دکانوں کے بن جانے سے اس کی جو اہمیت بڑھنے والی تھی کاروباری لوگ اسے بخوبی جانتے تھے۔ جیسے ہی پارک کی زمین پر دکانوں کے نقشے اُبھرے۔ ضرورت مندوں کی دوڑ دُھوپ شروع ہو گئی اور لوگ منہ مانگا دام دینے کو تیاّر ہو گئے۔

مندر کے نرمان کے ساتھ دکانوں کے بننے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

مندر کی تعمیر میں کئی مہینے لگ گئے۔ اس کے اندرونی حصّے کی سجاوٹ دیدہ زیب تھی۔ تمام دیواروں پر بیل بوٹے جڑے تھے اور باہری حصّے کو بھی نقش و نگار سے اس طرح مزین کیا گیا تھا کہ ہر طرف کاریگروں کی ہنرمندی کا کمال نظر آتا تھا۔

سمیتی والوں نے بہت سوچ سمجھ کر دُکانیں کرائے پر اٹھائی تھیں اور ہر طرح کے لوگوں کی ضرورتوں کا خیال رکھا تھا۔ گاہکوں کو رِجھانے کے طریقے بھی اپنائے گئے تھے۔ دُور دُور سے خریدار آنے لگے اور یہ ایک اچھا تجارتی مرکز بن گیا۔

شہر کے کئی بڑے گھرانوں سے کنول کے تعلقات تھے۔ ذی حیثیت اور کچھ قابلِ احترام شخصیتوں کے ساتھ ان کا ملنا جلنا تھا، اور وہ کام نکالنا جانتے تھے۔ انھوں نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ کا خوب فائدہ اٹھایا اور مندر کے نرمان میں دلچسپی رکھنے والے اپنے کئی قریبی ساتھیوں کی ہمّت افزائی کے لیے ان کے نام مندر نرمان سمیتی میں شامل کر لیے اور ان کی ہمدردیاں بٹور لیں۔

مندر بنانے، سجانے اور سنوارنے میں پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی اور اسے پورا کرنے میں سبھی کنول کا جی جان سے ساتھ دے رہے تھے۔

بھگوان کا ایسا کرم ہوا اور کنول کی مہربانیاں شامل حال رہیں کہ جلد ہی سمیتی والوں کے قد سماج میں اونچے ہو گئے۔ ان کے بینک بیلنس بھی بڑھے اور شہروں میں ان کی بڑی بڑی

کوٹھیاں جگمگانے لگیں۔

کپتان کنول اپنے دوستوں کے بے حد شکر گزار تھے کہ ان کی مدد کے بغیر اتنا بڑا کام انجام دینا اکیلے ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

مندر دیکھنے لائق تھا۔ اس کی بلندی آسمان چھو رہی تھی اور دیواروں پر بنے گل بوٹے دُور سے ہی دیکھنے والوں کا من موہ رہے تھے۔ آس پاس سے گزرنے والے راہی بھی اس کے خوشنما برجوں پر ایک نظر ڈال لینا اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے تھے۔

دُور دُور تک مندر کی خوبصورتی اور اس کی دلکشی کے چرچے ہونے لگے اور کنول کی نیک نامی بھی پھیلتی رہی، لیکن مندر ابھی تکمیل کے آخری مرحلے میں تھا کہ کپتان کنول کا تبادلہ دوسری جگہ ہو گیا۔ وہ بہت دل برداشتہ ہو گئے۔ من اُچاٹ ہو گیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی شہر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، لیکن نئی جگہ انھیں بالکل راس نہیں آئی۔ آب و ہوا کا اثر تھا۔ جسمانی تھکاوٹ یا کام کی زیادتی کا احساس۔ طبیعت گری گری سی رہنے لگی اور وہ بجھ سے گئے۔

اب تو ان کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح ان ذمہ داریوں سے چھٹکارا پالیں اور سر سے اس بوجھ کو اُتار کر زندگی کے باقی دن بھگوان کی عبادت میں گزار دیں۔ اور پھر ایک روز انھوں نے وقت سے پہلے ہی اپنی ملازمت سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

جیسے ہی سمیتی والوں کو کپتان کنول کی دلی خواہش کا علم ہوا، انھوں نے مندر رزمان سمیتی کی مجلسِ عاملہ کی ایک بیٹھک بلائی، جس میں اتفاق رائے سے ایک تجویز پاس کر کے آئندہ پانچ برسوں کے لیے مندر رزمان سمیتی میں کسی نئے ممبر کی شمولیت کو خارج از امکان قرار دے دیا گیا تھا۔

حالانکہ جب مندر رزمان سمیتی کا وجود عمل میں آیا تھا تو تمام لوگوں نے متفقہ طور پر کپتان کنول کو سمیتی کا چیئرمین بنانے کی تجویز پیش کی تھی، مگر کنول سرکاری نوکری میں تھے۔ انھوں نے خود ہی یہ عہدہ قبول کرنے سے اجتناب کیا تھا۔

OO

مہر بلب

بیٹے کے فیصلے پر ماں سناٹے میں آ گئی۔

حالانکہ بابل نے جو لڑکی پسند کر رکھی تھی، وہ کسی لحاظ سے قابلِ انکار نہیں تھی۔ اچھا بھلا خاندان تھا، ذات برادری اور شکل و صورت کی بھی اچھی تھی۔ پر وہ کرے بھی تو کیا کرے؟ گھر کی عزّت داؤں پر لگی تھی۔ باپ کی مرضی اور بیٹے کی ضد نے اسے پریشانی میں ڈال رکھا تھا، جس سے نجات پانے کی کوئی صورت اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔

بابل کے ابو کو اپنے ایک دیرینہ دوست فہیم کی لڑکی خوشبو بہت پسند تھی اور اس نے بچپن میں ہی اس کا ہاتھ اپنے بیٹے کے لیے مانگ لیا تھا۔ تب سے ہی بابل اور خوشبو ایک دوسرے سے منسوب ہو گئے تھے اور جان پہچان کے دو گھروں کے بیچ ایک پائیدار رشتے کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ شادی اپنے وقت پر ہو گی اور وہ دن ابھی بہت دُور تھے۔

لیکن جب دونوں شادی کی عمر کو پہنچے تو حالات بہت بدل چکے تھے۔ بابل نے خوشبو کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا۔ ماں گہرے صدمے میں ڈوب گئی۔ اس نے حیرت سے بابل کی طرف دیکھا۔ دھیرے سے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیئے اور بولی۔

''بیٹا، کسی بہکاوے میں مت آ۔ اچھی طرح سوچ لے۔ گھر کی عزّت کا سوال ہے۔''

پر بابل دَم سادھے کھڑا سنتا رہا۔ اس کی نگاہیں ماں کے چہرے پر جمی رہیں اور ذہن خیالوں میں اُلجھا رہا۔

اس دن کی شام، جب وہ کالج سے گھر لوٹا تو ایک الگ بات ہو گئی۔ برآمدے میں بیٹھی ایک پڑوسن نے اس کی ماں کے سامنے اس کی شادی کا تذکرہ چھیڑ رکھا تھا۔ شاید وہ شہر

کے کسی اچھے گھرانے سے اس کے لیے رشتہ لے کر آئی تھی۔ایک ساتھ کئی اندیشے بابل کے من میں اُبھر آئے اور اسے یہ فکر پڑگئی کہ اگر وقت رہتے اس نے گھر والوں پر اپنی پسند ظاہر نہیں کردی اور والدین نے اس کی مرضی کے خلاف فیصلہ لے لیا تو بات بگڑ جائے گی اور وہ کہیں کا نہ رہے گا۔ پر ابو کے سامنے تو اسے زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔لیکن وہ ماں سے بہت محبت کرتا تھا۔اس کی خوشیوں کی خاطر ماں نے بھی اپنا سکھ چین کھویا تھا، راتوں کی نیندیں گنوائی تھیں، مگر کبھی اُف نہیں کیا۔رات جب وہ کسی کام سے اس کے کمرے میں آئی تو بابل نے بڑے پیار سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے انجو کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

انجو اس کی ہم عمر اور ہم خیال تھی۔نہایت خوبصورت، سلیقہ مند اور شگفتہ مزاج۔دونوں کالج کے ایک ہی کلاس میں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے اور اکثر بابل کی سیٹ بھی اس کی سیٹ کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔انجو کا پُرکشش چہرہ اور گھنگھرالے بال بابل کو بہت اچھے لگتے تھے۔جلد ہی دونوں کی دوستی کالج کی حدوں سے نکل کر اپنائیت کے جذبے میں تبدیل ہوگئی۔زندگی میں بہاروں کے نئے رنگ بھر گئے اور زندگی کا یہ سفر بڑا خوشگوار اور پُر لطف ہو گیا۔

انجو اس کی چاہت میں دنیا بھول گئی اور بابل نے اسے اپنی تمام سوچوں کا مرکز بنا لیا۔ اب تو خوشبو بابل کے لیے ایک بھولی بسری کہانی بن چکی تھی۔اس کی یادوں کا بابل کی ذات سے کوئی تعلق بھی نہیں رہا تھا۔اسے تو بس اتنا یاد تھا کہ انجو اس کی پسند ہے۔اس کا پیار، جس کو پانا، اس کی زندگی کا مقصد۔

بابل ایک لمحہ کے لیے رُکا۔ماں کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور پھر بولا۔

''انجو جتنی خوش اخلاق ہے، شکل وصورت کی بھی وہ اتنی ہی بھلی ہے۔اس کے والد کسی کالج میں ہیڈ کلرک ہیں اور ماں ایک انگلش اسکول میں پڑھاتی ہے۔انھوں نے کبھی ہماری دوستی پر اعتراض نہیں کیا۔اگر تمھیں انجو میں کوئی کمی نظر آتی ہے تو مجھے بتاؤ!''

ماں نے یکلخت اپنی انگلیاں اس کے منہ پر رکھ دیں اور بے حد نرم لہجے میں بولی۔

''میں نہیں کہتی کہ تیری پسند بری ہے بیٹا۔ پر اتنا تو یاد رکھ کہ تیرے ابّو نے کسی لڑکی

والے کو زبان دے رکھی ہے۔ تیرے انکار سے خوشبو کے گھر والوں پر کیا گزرے گی۔ کالج کی دوستی کا کیا بھروسہ۔ آج ہے کل نہیں۔ گھر بار سنبھالتے ہی آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ دوستی اپنی جگہ۔ میری مان، شادی کا معاملہ تو ہم لوگوں پر چھوڑ دے۔''

ماں چند لمحے رُکی پھر بولی۔

''شاید تجھے نہیں معلوم بیٹا کہ جب تو بہت چھوٹا تھا، تب ہی تیری ماں ایک سڑک حادثے میں ماری گئی تھی۔ اس کے بعد ہی میں تیری ماں بن کر اس گھر میں آئی ہوں۔ کبھی تجھے ماں کی کمی محسوس ہونے نہیں دی۔ تیری ہر خواہش پوری کی۔ تجھ پر سب کچھ لٹا دیا۔ اب تو اس بات کا بھی کوئی مشکل سے یقین کرے گا کہ تو میری کوکھ سے جما نہیں ہے۔''

''جانتا ہوں ماں! اسی لیے تو تمھیں سب کچھ بتا دیا کہ ابّو کو منانے میں تمھیں کوئی دُشواری نہ ہو!''

''پھر کہتی ہوں بیٹا کہ تو ہماری بات مان لے۔ خوشبو بڑی پیاری لڑکی ہے!''

''میں نے بھی انجو سے کچھ وعدے کر رکھے ہیں ماں۔ اس سے الگ رہ کر جینا میرے لیے ممکن نہیں رہا!'' بابل کے خواب اس کی آنکھوں میں اُتر آئے تھے۔

بیٹے کے جواب نے ماں کو شدید اُلجھن میں ڈال دیا۔ اس کے چہرے پر اُداسی کی لہر دوڑ گئی۔ گلا رُندھ گیا۔ اس نے پلّو سے آنکھیں پونچھیں اور سر جھکائے سوچنے لگی۔

بابل کوئی بچہ نہیں تھا۔ اپنے ابّو وسیم ہی کی طرح دراز قد، خوبصورت اور نیک طبیعت تھا۔ مگر اب تو بچّے جوان ہوتے ہی اپنی شرطوں پر جینا چاہتے ہیں۔ آج بابل بھی باپ کی طرح ضد پر اَڑا تھا۔ ماں نے اسے سنبھالنے کی ایک اور کوشش کی۔

''کیسی باتیں کرتا ہے رے۔ تیری یہی ضد تو مجھے اچھی نہیں لگتی!''

''میں نے کہہ دیا ماں کہ میں انجو کے سوا کسی اور سے شادی نہیں کروں گا۔''

ماں نے اسے سنبھالنے کے سارے جتن کر ڈالے، مگر بابل کی آنکھوں سے انجو کا نشہ نہیں اُترا، تو اس کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ اب وہ اس معاملے کو سلجھانے کی کون سی تدبیر اختیار کرے۔ وہ بابل کے ابّو کے مزاج سے واقف تھی کہ ان کے منہ سے نکلی ہوئی بات

پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس معاملے کو لے کر گھر میں کسی طرح کا تنازعہ کھڑا ہو۔ اگر بیٹا باپ کے سامنے بھی اپنی بات پر اڑا رہا تو اچھے بھلے تعلقات میں دراڑ پڑ جائے گی۔ ذرا سی بات گھر سے نکلی نہیں کہ باہر کیا سے کیا ہو جائے گا۔ لوگ معاملے کو بلا وجہ اُچھال کر مذاق بنا ڈالیں گے۔ آدمی کا جینا دوبھر ہو جائے گا۔ مگر وہ کرے تو کیا کرے؟ حالات سے سمجھوتے کی کوئی صورت اسے نظر نہیں آئی تو ایک روز اس نے بابل کے ابّو کے کانوں میں یہ بات ڈال دی۔

مگر وسیم نے اس کی باتوں کو مذاق میں ٹال دیا۔ اسے بیٹے کی ذات پر بھروسہ تھا کہ وہ کبھی اس کی بات نہیں ٹالے گا۔ جس نے کبھی اس کے سامنے منہ کھولنے کی ہمّت نہیں کی بھلا وہ کیسے اس کی مرضی کے خلاف قدم اٹھائے گا۔ پھر بھی اس نے اپنی تسلّی کے لیے بابل کا من ٹٹولنے کا ارادہ کر لیا۔

اور اس روز جب وسیم کو بابل سے تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع ملا تو فضا بڑی خوشگوار تھی۔ چودھویں کا چاند درخت کی پھنگیوں میں اٹکا اس کے کمرے کی کھڑکی کے سامنے آ کر جیسے ٹھہر گیا تھا اور دریچے سے جھانکتی ہوئی چاندنی کمرے کی مدھم روشنی سے لپٹ کر فرش پر جگہ جگہ بکھری پڑی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر وسیم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے بابل سے پوچھ لیا۔ ''خدا کا دیا تو گھر میں سب کچھ ہے بیٹا۔ ایک بہو کی کمی کھٹکتی ہے۔ چاہتا ہوں اس ذمے داری سے بھی چھٹکارا پا لوں!''

''جیسی آپ کی مرضی!'' بابل سر جھکائے کھڑا رہا۔

''تو ٹھیک ہے۔ میں خوشبو کے ابّو کو بلوا لیتا ہوں۔ کوئی اچھی سی ساعت دیکھ کر ہم لوگ شادی کی تاریخ طے کر لیتے ہیں!''

''لیکن ماں نے بھی ایک لڑکی دیکھ رکھی ہے ابّو! جو خوشبو سے اچھی ہے!''

وسیم کے لیے بیٹے کا جواب ناقابلِ برداشت تھا۔ مگر اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا کر کسی طرح صبر کیا اور ایک لمبی سانس لے کر دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

''میں فہیم کو زبان دے چکا ہوں بیٹا۔ یہ ہماری عزّت کا سوال ہے!''

ابّو کا دوٹوک جواب سُن کر بابل کو لگا کہ اگر آج اس نے موقع گنوا دیا اور زبان نہیں کھولی تو زندگی کی بازی ہار کر اسے عمر بھر پچھتانا پڑے گا۔ اس نے سر اٹھا کر ابّو کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولا۔

''اس میں ہرج کیا ہے ابّو! ہم لوگ خوشبو کے لیے کوئی اچھا سا لڑکا ڈھونڈ لیں گے!''

بابل کی اس جرأت پر وسیم تلملا اٹھا۔ یکلخت اس نے ہونٹوں سے سگریٹ نکال کر کرایش ٹرے میں مسل دیا اور ایک لمبی سانس لے کر اُداس لہجے میں بولا۔

''پھر تُو تو گھر کی عزت نیلام کرنے پر تُلا ہے بیٹا۔ میں کسی کو کیا منہ دکھاؤں گا!'' اس کے وجود کا سارا دکھ اس کے چہرے پر اتر آیا تھا۔

''آپ بھی تو اپنی عمر میں اسی فیصلے سے گزرے ہیں ابّو، جس کا آج مجھے سامنا ہے!''

''ہاں بیٹا، تُو نے ٹھیک کہا۔ یہی تو میری بھول تھی۔ لیکن جب تیری ماں مَری تو میں نے بھی دوبارہ شادی وہیں کی جہاں گھر والے چاہتے تھے؟'' باپ کی آواز بھرّا گئی۔ آنکھوں میں زندگی کے نہ جانے کتنے واقعات پلک جھپکتے گزر گئے۔ لیکن بابل ابّو کی پوری بات سننے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''میں بھی یہی چاہتا ہوں ابو کہ آپ نے جو روایت قائم کی ہے وہ اپنی جگہ برقرار رہے!''

وسیم کو لگا جیسے بیٹے سے کہنے کے لیے اب اس کے پاس کچھ نہیں بچا ہے۔ اس نے لب کھولے۔ مگر آواز گم ہوگئی۔ اور وہ اپنے اندر اٹھتے ہوئے طوفان پر قابو پانے کے لیے کھڑکی سے باہر خلا میں جھانکنے لگا۔ سڑک کے اُس پار درختوں کے جھنڈ سے جھانکتا ہوا چاند ہر سو اپنے حسن کا جادو جگا رہا تھا۔

○○

تحفہ

حامد شیخ کو ملک کے سب سے بڑے اعزاز سے نوازا گیا تھا۔

بات اہم تھی۔ اس نوازش کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ پژمردہ چہرے کھل اٹھے۔ عارضوں پر شادمانی لوٹ آئی۔ مرجھائی کلیاں شبنم کی ٹھنڈک اپنے وجود میں اُتار کر تازہ دم ہوگئیں۔ حامد شیخ کے ارادوں کی پختگی نے وردی کی انفرادی پہچان کو جلا بخشی تھی۔ اس کے نقوش اور گہرے بنادیئے تھے۔ دنیا کی نگاہیں اس کی شخصیت پر مرکوز ہوگئیں۔

کچھ دنوں پہلے کی بات ہے۔ ہمارے ایک پڑوسی نے ہم پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کی تھی۔ ایک روز اس نے ہم پر شبخوں مارا، لیکن ہم نے ان کی ایک نہ چلنے دی اور ایک جھٹکے سے اس کے دونوں بازو علیحدہ کر ڈالے۔ وہ اپنا ناکارہ جسم اور مفلوج ذہن لے کر اپنے گھونسلے میں جا چھپا۔ ایک بار پھر ہماری سپاہ نے اپنی برتری ثابت کردی تھی اور ہم نے اسے جو عزّت اور توقیر دے رکھی تھی اس کی لاج بچالی۔ اپنا وقار بحال رکھا۔ بہادری اور جرأت مندی کی ایک اور مثال سامنے رکھ دی۔

حامد شیخ کو اس کی ویرتا کے لیے یہ انعام دیا گیا تھا۔ ایک شاندار تقریب میں جب اس کی بیوہ نے یہ انعام وصول کیا تو لوگوں نے تالیاں بجا بجا کر اپنی خوشیوں کا اظہار کیا اور عقیدت کے پھول نچھاور کیے۔

حامد شیخ معمولی سپاہی کی طرح فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ مضبوط حوصلے کا آدمی تھا۔ جلد ہی ترقی کر کے حولدار بن گیا۔ اس نے بڑی بہادری دکھائی۔ نہ ٹوٹنے والے ٹینکوں کو توڑ کر اس نے جامِ شہادت نوش کیا۔ دشمن کو زیر کر کے ملک کی ایک نئی تاریخ مرتب کی تھی۔

ہمیں آزادی جان سے زیادہ پیاری تھی۔ ہم اپنے محافظوں کی قدر کرنا جانتے تھے۔ ہمیں تجربہ تھا۔ کبھی ہم صدیوں مشکلات میں گھرے رہے تھے۔ انصاف نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی تھی۔ وہ میرا مالک بنا ہوا تھا۔ ہم اس کے غلام تھے۔ ہم پر عرصۂ حیات تنگ تھا۔ اس کے پسینے کی قیمت مہنگی چکانی پڑتی تھی۔ ہم اپنی آواز کو ترس گئے تھے۔ ہمارے خیالات پر وہ اثر انداز ہوتا تھا۔ ہماری تحریروں پر اس کی چھاپ ہوا کرتی تھی۔ ہمارے گھروں میں ہماری حدیں مقرر تھیں اور اس کے اختیارات لامحدود تھے۔

تب ہم میں سے ایک شخص جو بدیسوں میں تعلیم پا کر آیا تھا، دراز قد کا دُبلا پتلا سا آدمی، لمبی ناک اور آنکھوں پر چڑھی گول شیشوں والی عینک، بڑی طرحدار شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے دھوتی کی لنگوٹی بنائی۔ پاؤں میں کھڑاؤن ڈالے اور ایک منحنی سی لکڑی لے کر سڑکوں پر نکل آیا اور پھونک مار کر اس نے ہمارے احساس میں چھپی چنگاری کو بھڑکا دیا۔ ہماری رگِ حمیت کو چھیڑ دیا۔ اس کی بانسری کی لے اتنی مدھر تھی کہ لوگ گھروں سے باہر آ گئے اور جوق در جوق اس کے گرد جمع ہوتے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑا کارواں اس کے ساتھ ہو گیا۔

اور پھر ہم اپنے آقا کے تابوت کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے برسہا برس خاردار جھاڑیوں سے گزرتے رہے۔ صلیبوں پر لٹکتے، دار پر چڑھتے، اسے کئی سمندر پار دریاؤں کے سپرد کرنا تھا۔ صحراؤں میں ببول کے کانٹوں نے ہمارے جسم کو لہولہان کر دیا۔ جنگل میں زہریلے جانوروں نے کتنوں کو ڈس لیا۔ کچھ کو زمین نگل گئی۔ سخت دُھوپ سے بچنے کے لیے کھنڈروں میں پناہ چاہی تو اس کی شکستہ دیواروں کے پیچھے بہتوں کو چن دیا گیا۔

آسمان آگ برساتا رہا اور ہم موم کے محل تعمیر کرتے رہے۔ بادل جم کر برستا رہا اور ہم کچے مکان اٹھاتے رہے اور پھر ایک دن تھک کر اس نے ہار مان لی۔

ہم نے سکھ اور شانتی کو اپنی زندگی کا آدرش بنا لیا۔ مساوات ہماری برادری کی بنیاد بنی۔

حامد شیخ متوسط طبقے کا آدمی تھا، مگر شہر میں اس کے گھرانے کو بڑی عزت ملی ہوئی تھی۔ کامدار ظروف بنانا وہاں کے لوگوں کا آبائی پیشہ تھا۔ اپنے پیشے کے لحاظ سے وہ پورے دیس میں جانے پہچانے جاتے تھے۔

شہر بڑا قدیم تھا۔ تاریخی، تہذیبی اور تجارتی اعتبار سے اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم تھی۔ ملی جلی آبادی، بھائی چارے کی فضا، سکھ اور اطمینان کے ماحول میں ہر ذات اور فرقے کے لوگ وہاں ایک زمانے سے ساتھ رہتے چلے آرہے تھے۔

لیکن پچھلے کچھ دنوں سے شہر میں کشیدگی چل رہی تھی۔ ذات پات کا کوئی جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اونچ نیچ کے اختلاف نے آپسی رنجشوں کو اتنی ہوا دی تھی کہ کبھی بھی کچھ ہو جانے کا خدشہ بنا ہوا تھا۔ حکام حالات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ پولیس تعینات کر دی گئی تھی۔

ایسے ہی موسم میں ایک روز عید آگئی۔

صبح کا رُوپ بڑا نکھرا ہوا تھا۔ مگر نرم دُھوپ میں سراسیمگی کے آثار تھے۔ وقت کی رفتار دھیمی تھی۔ چھت کے منڈیروں پر خوف کے بادل منڈلا رہے تھے۔ نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ بچّے، بوڑھے، جوان رنگ برنگی پوشاکوں میں ملبوس عیدگاہ جا چکے تھے۔

گھر کی عورتیں تھالیوں میں مٹھائیاں سجائے اور کٹوروں میں دودھ اور سوئیاں پروسے اُن کا انتظار کر رہی تھیں۔ راہ دیکھتے دیکھتے ان کی نگاہیں تھک گئیں۔ آنکھیں دُکھنے لگیں، مگر کوئی نہیں لوٹا۔ دُکھ کی گھڑیاں دہلیز پر آکر جم گئیں اور انتظار ان کا مقدر بن گیا۔

عیدگاہ میں شہر کی ساری آبادی سمٹ آئی تھی۔ لوگ صفیں درست کر کے نماز کی نیت باندھ چکے تھے اور جب نماز ختم ہونے کو آئی تو اسی لمحے کئی خنزیر نمازیوں کی صفوں میں گھس آئے۔ صفیں بکھر گئیں۔ نماز ادھوری رہ گئی۔ لوگوں کو بڑا غصہ آیا کہ جب چند سر پھرے ان خنزیروں کو عیدگاہ کی طرف ہکا رہے تھے تو وہاں تعینات پولیس کیا کر رہی تھی۔

وہ پولیس والوں سے اُلجھ پڑے۔

بات بڑھی تو بھگدڑ مچ گئی۔

شر پسند عناصر تو جیسے موقع کی تاک میں ہی تھے۔ انھوں نے خشت باری شروع کر دی۔ کچھ پولیس والے زخمی ہوئے۔ کچھ نمازیوں کو چوٹیں آئیں۔

اور جب بھیڑ بے قابو ہو گئی تو پولیس نے گولی چلا دی اور صحن کا شامیانہ ٹوٹ کر نمازیوں پر آ گرا۔ چھوٹے چھوٹے کئی نمازی بچّے اور جوان ہلاک ہو گئے۔

پل بھر میں خوشیوں کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔

اس حادثے نے فساد کی شکل اختیار کر لی اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی۔ سڑکوں اور گلیوں میں سناٹا چھا گیا۔ گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے بند ہو گئے۔ پولیس والوں نے اپنا سارا حساب چکا لیا۔ غنڈوں کو کھلی چھوٹ ملی۔ بے سہاروں کو لوٹا گیا مارا گیا۔ آبروریزی اور عصمت دری کے کئی واقعات دُہرائے گئے۔ اُجڑے گھروں اور لُٹی دُکانوں سے جو نقدی اور قیمتی زیورات برآمد ہوئے پولیس نے ان پر اپنا قبضہ بنا لیا۔ باقی سارا سامان بلوائی اپنے ساتھ لے گئے۔

پولیس کی غفلت اور لاپرواہی کی بھنک جب تنگ گلیوں کی تاریکیوں سے بھٹکتی ہوئی کھلی سڑک پر آئی تو فوج اپنی بیرکوں سے نکل کر حالات کو معمول پر لانے میں جٹ گئی۔

خون آشام منظر نے زندگی کا سارا لہو نچوڑ کر موت کے ماتھے پر مل دیا۔ ماحول پر سوگواری چھائی رہی۔

اور پھر ایک بڑی سی قبر میں اجتماعی طور پر بہت سی لاشیں ایک ساتھ دفنا دی گئیں۔ کرفیو کے دوران ماحول پر سناٹا چھایا رہا۔ سنسان سڑک کے بیچوں بیچ ایک کتا آسمان تک رہا تھا اور ہانپ رہا تھا۔ پیچھے کھڑی کتیا بھونک بھونک کر آسمان کو سر پر اُٹھائے ہوئے تھی۔ رہ رہ کر کتا بھی اس کی آواز کے پیچھے اپنی آواز اُچھال دیتا تھا۔

فوج کی گشت معمول پر تھی۔ دھیرے دھیرے حالات سدھرتے جا رہے تھے۔ وقفہ وقفہ سے کرفیو کے اوقات میں ڈھیل دی جا رہی تھی۔

مگر ان سب سے بے پرواہ ایک حولدار کی بیوہ سڑکوں پر کچھ تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں سویّوں سے بھرا ایک کٹورا بھی تھا۔

OO

تصویر کا دوسرا رُخ

''حکومت کے پاس ایسی کوئی سبیل نہیں کہ آپ کی مانگ پوری کی جاسکے۔ بہتر ہے کہ آپ ہڑتال واپس لے لیں۔ اگر ہڑتال ہوئی تو اسے خلافِ قانون سمجھا جائے گا اور سرکار ہڑتالیوں سے نمٹنا پوری طرح جانتی ہے!''

وہ برسوں سے سرکار کی یہ دھمکیاں سنتا آرہا تھا اور اپنی دھمکیوں کی پاداش میں اسے جیلوں کی ہوا کھانے کی ایک عادت سی پڑ گئی تھی۔ مگر کٹھن سے کٹھن مرحلوں سے گزر کر بھی اس نے کبھی حوصلہ نہیں ہارا۔ نہ تو جیل کی کال کوٹھری اسے گمنامی کے غار میں ڈھکیل سکی نہ جسمانی اذیتیں اور ذہنی پریشانیوں کا بوجھ اس کے ارادوں کو متزلزل کرسکا۔ وہ تو جب بھی جیل سے باہر آیا، ہر بار اس کے چاہنے والوں کی بھیڑ مقابلتاً پہلے سے زیادہ تھی۔

سیاست تو جمنا داس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ بچپن میں ہی اس کا سیاسی اور سماجی شعور بیدار ہو چکا تھا، جو آگے چل کر کالج کے کھیلوں علمی اور سیاسی مباحثوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اور بھی پختہ ہو گیا۔

وہ ایک بڑے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ جاگیردارانہ ماحول میں اس نے پرورش پائی، مگر ذہن نے کبھی اس ماحول کا اثر قبول نہیں کیا۔ اسے شروع سے ہی غریبوں کے مسائل سے دلچسپی رہی۔ مزدوروں کے دکھ درد کو اپنا سمجھا۔ کمزوروں پر ہو رہے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی اور ہمیشہ بے گھر اور بے آسرا لوگوں کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کی سعی کرتا رہا۔

اس نے گھر والوں کی مرضی کے خلاف اپنی آبائی کوٹھی میں غریبوں کے لیے اسپتال قائم کر کے گاؤں والوں کی ایک دیرینہ خواہش پوری کر دی۔ علاقے میں بچوں کے کئی اسکول

کھلوائے اور شہر کے اپنے رہائشی مکان کو کالج بنا کر اسے غریبوں کے لیے وقف کر دیا۔ پھر تو اس کی فیاضی اور نیک نامی کے اتنے چرچے ہوئے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی قدر و منزلت بہت بڑھ گئی اور رفتہ رفتہ اس کی شہرت گاؤں کی سرحدوں سے نکل کر ملک کے سیاسی اُفق پر بھی اپنے جلوے دکھانے لگی تو اسے بین الاقوامی سیاست میں بھی اپنی ایک الگ پہچان بنانے کا موقع مل گیا۔ بھوکے ننگے عوام جوق در جوق اس کی پناہ میں آتے گئے اور وہ غریبوں اور مزدوروں کا سب سے بڑا بہی خواہ بن گیا۔ اس کی آواز ایک بڑی جماعت کی آواز بن گئی۔

اس کی شخصیت بڑی دلنواز تھی۔ میانہ قد، گول چہرہ، صاف رنگ، چوڑی پیشانی، جس پر زمانے کی سختیوں کی تہہ در تہہ سلوٹیں۔ کالے خوبصورت فریم کی دبیز شیشوں والی عینک سے جھانکتی ہوئی سیاہ آنکھیں، جن میں کتنی تمناؤں کا درد تھا، کتنی حسرتوں کے الاؤ جل رہے تھے۔

باتوں میں وہ جادو کہ منٹوں میں اپنے گرد لوگوں کی بھیڑ اکٹھی کر لینا اور چٹکیوں میں ان سے اپنی باتیں منوا لینا اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ سیاست میں قدم رکھتے ہی جہاں کامیابیوں نے اس کے قدم چومے وہیں اسے آزمائشوں کی کڑی دُھوپ سے بھی گزرنا پڑا۔

وہ بڑا جادو بیان تھا۔ حکومت کی غلط پالیسی کے برے نتائج سے لوگوں کو خبردار کرنا اس کی عادت تھی، جس کے باعث وہ سرکار کے لیے دردسر بنا ہوا تھا۔ اسے توڑنے اور جھکانے کے کئی ہتھکنڈے آزمائے گئے۔ اس پر غداری کا مقدمہ چلا اور سچ اُگلوانے کے لیے آنکھوں میں پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ اسے برف کی سلوں پر لٹایا گیا، مگر سچ کے سوا اس نے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں تھا۔ سارے دُکھ جھیل لیے اور اُف تک نہیں کی۔

حالانکہ حکمراں جماعت میں بھی کچھ ایسے لوگ شامل تھے، جو جمنا داس کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے اور ان کی بھی یہ خواہش تھی کہ اپنی وزارت میں شامل کر کے لوگوں کو جمنا داس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کیا جائے، مگر وہ بھی نہ جانے کس مٹی کا بنا تھا کہ نام و نمود کی پرواہ کیے بنا وہ اس پیشکش کو برابر ٹھکراتا رہا۔

اس کی انگلیاں ہمیشہ وقت کی نبض پر رہتی تھیں اور وہ حکومت کے قول و عمل کو نگاہوں

سے ٹٹولتا رہتا تھا۔ کسی اعلیٰ افسر کی زیادتی کا سوال ہو یا کسی سیاسی رہنما کی بدعنوانی کا کوئی معاملہ، وہ حکومت کے غلط رویے پر ایسے تیکھے حملے کرتا تھا کہ ایوانوں میں بیٹھے کتنے لوگ اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس کرتے تھے اور حکومت لاجواب ہو کر ایک ضرب اس کے ماتھے پر لگا دیتی تھی۔

غریبوں کا ہمدرد، بھوکے ننگوں کا رہنما، مزدور رہنما، جمناداس جیسے بے سہاروں کی رہنمائی کے جرم میں نہ جانے کتنی اذیتیں اٹھانی پڑیں، ذلتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سیاسی انتقام کی آگ نے اس کے سارے خاندان کو جھلس کر رکھ دیا، مگر اس نے ہمّت نہیں ہاری اور ہمیشہ وقت کی کسوٹی پر کھرا اُترا۔

وقت گزرتا رہا۔ حکومت نے اپنے اقتدار کے کئی سال پورے کر لیے۔ یہاں تک کہ عہدیداروں نے کرسیوں کو اپنا مقدر سمجھ لیا اور ایوانوں میں بیٹھ کر اپنے گرد خوشامدیوں کی ایسی بھیڑ اکٹھا کر لی کہ وہ باہر کی دنیا سے بالکل بے خبر ہو گئے۔ اور ان کی ساری توجہ صرف اپنوں پر مبذول ہو کر رہ گئی۔ وہ اس بات کو بھی بھول گئے کہ انھیں اپنی بداعمالیوں کا حساب چکانے ایک نہ ایک دن پھر عوام کے سامنے آنا ہے، جن کی حمایت کے بغیر وہ ایوانوں میں لوٹ نہیں سکتے۔

وقت نے ایک بار پھر پلٹا کھایا، نئی تبدیلیوں کے ساتھ حالات بدلے، لوگ حکومت کی سرد مہری سے بدظن ہو چکے تھے۔ کچھ موسم نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا۔ کہیں خشک حالی اور کہیں سیلاب کے زور نے لوگوں کو بدحال کیا تو کہیں شہروں کو خوبصورت بنانے کے نام پر بہتوں کو اُجاڑ کر پریشان کیا گیا۔ خاندانی منصوبہ بندی کے نام پر تو نس بندی کے ایسے طریقے اپنائے گئے کہ غیر تو کیا اپنے بھی مخالف ہو گئے۔

حریف جماعتوں نے اس موقع کا خوب فائدہ اٹھایا۔ اخباروں کی بے بنیاد خبروں اور من گھڑنت افواہوں کو بنیاد بنا کر دیہاتوں اور بازاروں میں حکومت کی نااہلی کے ثبوت بانٹتے پھرے، یہاں تک کہ لوگوں کے شک کی گنجائش یقین میں بدل گئی۔

حکومت کو اپنی غلطیوں کا احساس تھا۔ اس نے اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالنے کی بڑی کوشش کی، مگر پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا اور لوگ اس ہیجانی کیفیت سے اُوب چکے تھے۔

جمنا داس صاحبِ اقتدار لوگوں کی دُکھتی رگوں کو پہچانتا تھا۔ ان مُدوں کو اس نے ایک بڑے حربے کے طور پر استعمال کیا اور حکومت کو آڑے ہاتھوں لے کر اس کی دھجیاں بکھیر دیں۔

حکومت تو اس سے تنگ اور عاجز تھی ہی، مجبور ہو کر اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیا اور مطمئن ہو گئی۔

مگر جیل خانوں میں رہ کر بھی جمنا داس چپ نہیں بیٹھا۔ اس نے لوگوں کے اندر ایسی روح پھونک دی کہ جیسے سب اس کے دیوانے ہو گئے اور حکومت مخالف محاذ بننے میں ذرا دیر نہیں لگی اور پھر وہ دن بھی آیا جب انتخابی دنگل میں جمنا داس نے اپنے سیاسی حریفوں کو شکست دے کر حکومت کا پانسا ہی پلٹ دیا۔

پھر تو جمنا داس کی کامیابی پر ہر طرف خوشیاں منائی گئیں۔ ہر جگہ اس کا والہانہ استقبال ہوا اور اسے وزیر کی حیثیت سے کابینہ میں شامل کر کے نئی حکومت بنائی گئی۔ جمنا داس اپنی ذمہ داریوں سے مطمئن تھا۔ اسے وہی کرسی عطا ہوئی جس کرسی پر بیٹھ کر صاحبِ اقتدار لوگ اس کے چاہنے والوں کی تقدیریں لکھا کرتے تھے۔

حالات یکسر بدل گئے۔ دیواروں پر نیا رنگ وروغن چڑھایا گیا۔ دریچوں کے پردے بدلے گئے اور دروازے پر نئے نام کی تختی لگا کر کرسیوں کی گرد جھاڑی گئی۔ کرسیاں وہی رہیں صرف بیٹھنے والوں کے چہرے بدل گئے۔

اب تو ہر شخص کی نگاہ اس پر جمی تھی۔ ہر کوئی خوابوں کی ایک دنیا سجائے بیٹھا تھا۔ کب اس کے سوکھے بنجر کھیتوں میں ہریالی ناچے گی۔ کب آنگن میں چاند اُترے گا اور اس کے گھر کی تاریکیاں دُور ہوں گی۔

مگر ہوا تو ایسا کچھ بھی نہیں۔

ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا، مگر نئی حکومت اپنے ہی بکھیڑوں میں ایسی اُلجھی رہی کہ لوگوں کے بنیادی مسائل کی طرف کسی کا دھیان تک نہیں گیا۔ پہلے عہدوں کی تقسیم نے دوستی میں پھوٹ ڈالی، پھر محکموں کے بٹوارے کو لے کر رشتے متاثر ہوئے اور ذہنی تناؤ کے ساتھ مَن مٹاؤ اتنا بڑھ گیا کہ اپنی اپنی ضد کے آگے سب مجبور ہو گئے اور اس حصار سے نکلنا کسی کے لیے ممکن نہیں رہا۔

اس خلیج کو پاٹنے کی بڑی کوشش کی گئی، مگر مسئلے کا کوئی حل کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ سب حالات کے آگے بے بس تھے۔ جمنا داس بھی جیسے اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا تھا۔

جب انتظار کی حد میں طویل ہوگئیں اور گندی بستیوں میں رہنے والوں کی زبوں حالی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ چمنی کے دھویں میں لپٹے ہوئے انسانوں کے چہرے پر خوشیوں کے جو اُجالے پھیلے تھے تاریکیوں میں ڈوبنے لگے۔ دھان کی خشک بالیاں، کھیتوں کے سوکھے پتے ہریالی کو ترستے رہے، تو لوگوں کے دلوں میں ٹھہرا ہوا طوفان جیسے مچل اٹھا اور حکومت کے خلاف صف بندی شروع ہوگئی۔ لوگ اس جوئے کو اُتار پھینکنے پر آمادہ ہو گئے جسے وہ نئی حکومت کی صورت میں اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور شکست خوردہ رہنماؤں کو اُمید کی ایک کرن نظر آ گئی۔ انھیں اپنی قسمت کا پانسا پلٹنے کا ایک موقع مل گیا اور وہ لوگوں کی آنکھوں میں نئے سپنے جگا کر ان کا رُخ اپنی طرف موڑنے میں کامیاب ہو گئے۔

پھر تو جلسے اور جلوسوں کی جیسے ایک باڑھ سی آ گئی۔ لوگ بے انصافی کے خلاف اپنے مطالبوں کی حمایت میں سڑکوں پر نکل آئے اور ہڑتالیں زور پکڑ گئیں۔

پچھڑی ذات کے پسماندہ لوگوں نے بھی اپنے پرانے نیتاؤں کا خوب ساتھ دیا اور نوکریوں میں اپنے لیے ریزرویشن کی مانگ کو لے کر ہڑتال کی دھمکی دے دی اور ایک پرانے لیڈر کی نئی قیادت میں اپنی مانگوں کو لے کر ایک وزیر کا دروازہ کھٹکھٹانے اس کی دہلیز پر جا پہنچے۔

ان کا ہر دلعزیز رہنما، غریبوں کی مسیحائی کا دعویدار جمنا داس ان کے دُکھوں کا مداوا بن کر عرضی لینے خود ان کے سامنے آیا اور اپنی زبان کے ایسے جادو جگائے کہ غصّے میں بھرے اودھم مچاتے ہوئے لوگوں کی تالیوں سے ساری فضا گونج اُٹھی اور لوگ خوش ہو کر جمنا داس زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔

ہاتھ وہی تھے صرف ان کی لکیریں بدل گئی تھیں۔ دینے والا ہاتھ اب لینے والا ہاتھ بن گیا تھا۔ وہی ہاتھ جو لاکھوں کروڑوں لوگوں کے ہاتھوں کی لکیریں بن کر سینکڑوں بار عرضیاں دے چکا تھا آج اسے وصول کر رہا تھا۔ اِس ہاتھ اور اُس ہاتھ میں فرق حال اور ماضی کے درمیان اٹکا کاغذ کا صرف ایک ٹکڑا تھا۔

جمنا داس واپس اپنی میز پر آ گیا اور عرضداشت پر نظر دوڑائی۔ اسے مانگیں بے جا اور نامناسب لگیں جن کا پورا کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس جنجال سے چھٹکارا پانے کی کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کی کرسی ڈگمگا رہی ہے۔ اس نے ایوان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ تمام نمائندہ شخصیتوں کے چہرے پر بے اطمینانی تھی اور ہر شخص اپنے سے اونچا عہدہ پانے کی تگ و دو میں مصروف تھا اور ساری کرسیاں ڈگمگا رہی تھیں۔

جمنا داس کے اشارے پر مظاہرین کے چند نمائندوں کو اندر آنے کی دعوت دی گئی۔ نمائندے آئے۔ ماحول کا سرسری جائزہ لیا۔ سب کچھ جانا پہچانا لگا۔ لمبے لمبے ٹیبلوں پر کئی فائلیں رکھی تھیں۔ ایش ٹرے میں پڑے سگریٹ کے اُدھ جلے ٹکڑوں سے تمباکو کی بھینی بھینی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ کھڑکیوں پر نیلے پردے لٹک رہے تھے۔ فرش پر ایرانی قالین بچھا تھا۔ بائیں ہاتھ کی جانب تپائی پر دو ٹیلیفون رکھے تھے۔ سامنے کی دیوار پر ایک گھڑی ٹنگی تھی اور گھڑی کے ٹھیک نیچے ایک بڑا سا کیلنڈر جھول رہا تھا اور پشت کی جانب دیوار پر مہاتما گاندھی کی تصویر آویزاں تھی۔

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اصل مسئلہ زیر بحث آیا۔ دونوں نے اپنے اپنے نظریے سے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی بڑی کوشش کی مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ بات جہاں سے چلی تھی وہیں آ کر رُک گئی۔ سب سوچنے لگے۔ کہیں وہ کسی غلط جگہ تو نہیں آ گئے۔ جمنا داس کے الفاظ تیر بن کر ان کے دِلوں کو چھید رہے تھے۔ کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ بیتے ہوئے لمحوں کی بازگشت۔ وہی گھسی پٹی سی آوازیں بالکل پرانی۔ صرف انداز بدلا ہوا۔

''آپ کی مانگیں جائز ہیں، مگر سابقہ حکومت نے ملک کا اقتصادی ڈھانچہ اس طرح بگاڑ رکھا ہے کہ ہمارے لیے آپ کی مانگیں پوری کرنا ممکن نہیں۔ آپ اپنی ہڑتال واپس لے لیں۔ اگر یہ ہڑتال ہوئی تو اسے غیر قانونی مانا جائے گا اور سرکار ہڑتالیوں سے نمٹنا پوری طرح جانتی ہے!''

OO

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں

چرچراہٹ کی بھاری آواز نے لوگوں کا دھیان اپنی طرف کھینچ لیا۔ آس پاس کے سبھی دُکاندار اور راہ گیر چونک پڑے۔ ڈرائیور نے جیپ میں اچانک بڑے زور کا بریک لگایا تھا پھر بھی وہ اسے موٹر کی زد میں آنے سے بچا نہیں سکا۔ دھکے کھا کر بوڑھا دُور سڑک پر پھینکا گیا اور گاڑی چھناکے کی آواز کے ساتھ سڑک کے کنارے کھڈّے میں جا گری۔

بوڑھے کو کافی چوٹیں آئیں۔ بازو چھل گئے۔ سر پھٹ گیا۔ کپڑے خون میں تر ہو گئے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر لوگوں کو ڈرائیور پر بڑا غصہ آیا، لیکن جب ان کی نظر ڈرائیور پر پڑی تو ان کے غصے ٹھنڈے پڑ گئے۔ ڈرائیور الگ خون میں لت پت پڑا تھا۔ صرف کراہنے کی آواز اس کے منہ سے نکل رہی تھی۔

لکھن ایک پسماندہ گھرانے کا معمولی پڑھا لکھا آدمی تھا۔ بدحالی اور تنگدستی اسے ورثے میں ملی تھی۔ وہ ریلوے کے کسی افسر کے یہاں گھریلو ملازم تھا۔ نہایت محنتی اور ایماندار۔ اس نے ہمیشہ خود کو شک کے گھیرے سے دُور رکھا، جس کے باعث گھر کے سبھی لوگ اسے پسند کرتے تھے۔

جب افسر کے تبادلے کی بات چلی تو جانے سے پہلے اس نے انسانیت کے نام پر اتنا ضرور کیا کہ لکھن کو ریلوے میں چپراسی کی نوکری دلوا دی، جس کا احسان لکھن کبھی نہیں بھولا اور ساری عمر اس کے گن گاتا رہا۔

لکھن کو اس کی بہتر کارکردگی کے سلسلے میں ترقی کے کئی چانس ملے، مگر قسمت کا کھوٹا تھا۔ چپراسی سے معمولی کلرک بھی نہیں بن سکا۔ البتہ اس کی تنخواہوں میں گاہے بگاہے اضافہ

ضرور ہوتا رہا۔

لکھن کو اپنی کم علمی کا دُکھ ہمیشہ ستاتا رہا، اسی لیے اس نے بال بچوں کی پڑھائی پر بہت دھیان دیا۔ اس کو ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں ۔ بڑا لڑکا کندن بہت ہونہار اور پڑھائی کا حد درجہ شوقین تھا۔ ہمیشہ اچھے ریزلٹ کرتا رہا۔ میٹرک میں اس نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ انٹرمیڈیٹ میں فرسٹ ڈیویژن سے پاس ہوا۔ بی۔اے میں اس نے اپنے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے اور پوری یونیورسٹی میں اوّل آیا۔

کندن اپنی کامیابی پر بہت مطمئن اور مسرور تھا۔ اسے اپنے خوشگوار مستقبل کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ وہ اپنے سپنوں کو نیا رنگ دے کر اُس کی تعبیروں میں زندگی کا رس گھولنے لگا اور اس نے نوکری کی تلاش شروع کردی۔

لکھن کی بھی ایک بڑی آرزو پوری ہوئی تھی۔ فخر سے اس کا سینہ تن گیا اور اسے امید ہوگئی کہ کندن کو نوکری ملتے ہی اس کے دن پھر جائیں گے۔ اب اس کا ایک ہی منشا تھا کہ کسی طرح نوکری میں رہتے ہوئے وہ کندن کو ریلوے میں بحال کرادے تو اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا ورنہ سبکدوشی کے بعد کون کس کو پوچھتا ہے۔

آفس کے بڑے بابو اوم پرکاش سے اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ اوم پرکاش اچھے خیال اور بڑے تعلق والا آدمی تھا۔ لکھن پر بھی اس کی مہربانیاں کم نہیں تھیں۔ اس نے کندن کی سفارش کے لیے پہلے سے ہی بڑے بابو کو تیّار کر رکھا تھا اور دفتر کے دوسرے ساتھیوں کے کانوں میں بھی یہ بات ڈال دی تھی کہ کسی اچھی جگہ کندن کے لائق کوئی ویکنسی نکلے تو اس کی بحالی کا کوئی راستہ ضرور نکالنا۔

کندن اپنے طور پر بھی نوکری کی تلاش میں جٹا تھا۔ روزانہ اخبار دیکھنا اور وانٹیڈ کالموں میں سر کھپانا اس کی عادت بن چکی تھی۔ بار بار بحالی کے دفتروں کے چکر لگاتے اور انٹرویو دیتے اسے اُکتاہٹ محسوس ہونے لگی اور وہ تھک سا گیا۔ نہ تو اس کی ڈگری اس کے کسی کام آئی اور نہ بڑے بابو کی بھاگ دوڑ کا کوئی اثر ہوا۔ اسے انٹرویو میں بلایا ضرور گیا اور اس نے سوالوں کے تشفی بخش جواب بھی دیئے، لیکن ہر بار اسے ناکامی کا منہ ہی دیکھنا پڑا۔ کامیابی صرف انھیں

امیدواروں کے حصّے میں آئی جن کے پاس اپنی سفارشوں میں کسی منسٹر کا خط تھا یا جنھوں نے حاکموں کو خریدنے کے لیے بھاری رقمیں خرچ کیں۔

مگر اس بار لکھن بڑا پراُمید تھا۔ سرکاری اسکولوں میں کچھ ماسٹروں کی بحالیاں تھیں، جس کے لیے کندن نے بھی اپنی اُمیدواری کا فارم بھرا تھا۔ تحریری مقابلہ جاتی امتحانوں میں اسے کامیابی ملی۔ تب اسے اورل ٹسٹ کے لیے بلالیا گیا۔

اتفاق سے زبانی امتحان کے لیے اسے جس انتخابی بنچ کے سامنے پیش ہونا تھا اس کے چیئر مین ورما صاحب اوم پرکاش کی جان پہچان کے نکل آئے۔ اس کی آنکھوں میں خوشیوں کے دیے جل اُٹھے۔ بڑے بابو نے پیروی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور پہلی فرصت میں ورما صاحب سے مل کر اپنے آنے کا مقصد بیان کر دیا تو ورما نے کندن کے تعلیمی ریکارڈ سے متاثر ہو کر اوم پرکاش کو اس بات کی تسلّی دے دی کہ اس سے جو کچھ بھی بن پڑے گا وہ کندن کے لیے ضرور کرے گا۔

مگر جس دن کندن کا اورل ٹسٹ تھا اس سے چندروز پیشتر ہی اوم پرکاش ایک ایکسیڈنٹ میں مارا گیا۔ وہ آفس کے کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا کہ واپسی میں ٹرین ایک بڑے حادثے کا شکار ہو گئی۔ جہاں بیسوں لوگ مارے گئے وہاں بڑے بابو نے بھی اسپتال پہنچتے پہنچتے دم توڑ دیا۔ اوم پرکاش کی موت کی خبر سن کر وہ سن رہ گیا۔

ہر طرف صفِ ماتم بچھ گئی۔ پورا گھر سوگ میں ڈوب گیا۔ دوسرے دن بڑے بابو کی لاش اس کے گھر آگئی۔

اس کے انتم سنسکار میں رشتے داروں کے علاوہ اس کے آفس کے بھی بہت سے لوگ شامل ہوئے۔ غمزدہ لکھن نے بھی بجھے ہوئے دل کے ساتھ اس کی ارتھی کو کاندھا دیا اور دیر تک شمشان گھاٹ کے کنارے چپ چاپ کھڑا جلتی چتا سے اُٹھتے دھویں کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا اب کیا ہوگا؟ کندن کو نوکری مل پائے گی یا نہیں؟ بس یہی ایک سوال تھا جو سینکڑوں بار اپنی شکل بدل کر اس کے ذہن میں اُٹھ چکا تھا۔

وہ تو اوم پرکاش ہی ایسا مخلص آدمی تھا اور اس کے بڑھاپے کا اتنا خیال کرتا تھا کہ جب

بھی اس نے اس سے کچھ کہا وہ سفارش کو پہنچ گیا، مگر اب تو وہ سہارا بھی اس سے چھن چکا تھا۔

بڑے بابو کی موت کوئی کم اہمیت کی حامل نہیں تھی۔ اس کے کریا کرم کے لیے سرکار کی جانب سے دسیوں ہزار کی فوری امداد بہم پہنچائی گئی۔ اس کی بیوہ کو لاکھوں کا معاوضہ ملا اور بڑے بیٹے کو سرکاری نوکری میں لیے جانے کی بات بھی طے پا گئی۔

اوم پرکاش کی موت سے جہاں اپنے پرائے سبھی دُکھی تھے وہیں لکھن کو بھی اس کے اُٹھ جانے کا کچھ کم دُکھ اور صدمہ نہیں ہوا۔ بڑے بابو کی چھایا تو اس کی اُمیدوں کا مرکز تھی۔ اوم پرکاش نے کندن کی بحالی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ کتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں اسے مگر قسمت کے لکھے کا کوئی کیا کرے۔ اس بار بھی بڑے بابو کی ذاتی دلچسپیوں اور اس کی دوڑ دُھوپ سے جو آخری اُمید بندھی تھی وہ اوم پرکاش کے نہیں رہنے سے یکلخت ختم تو نہیں ہوئی البتہ کچھ ماند ضرور پڑ گئی۔

اِنٹرویو کے دن وہ اس ارادے کے ساتھ کندن سے تھوڑا پہلے ہی گھر سے نکل گیا کہ عین موقع پر ورما صاحب کو اپنی صورت دکھا کر اس کی آنکھوں میں بڑے بابو کی ملاقات کا منظر جگا دے تا کہ بعد میں ورما صاحب کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملے کہ مجھے کندن کا کوئی دھیان ہی نہیں رہا۔

مگر انٹرویو کے بعد جب چیئرمین نے کندن کو الگ کمرے میں بٹھا کر اس سے اپنی مجبوریاں بتائیں اور بڑے بابو کی موت پر اپنے دُکھ کا اظہار کیا تو انٹرویو کی اصل حقیقت اس کی سمجھ میں آ گئی۔

بحالی کا سارا معاملہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ منتخب اُمیدواروں سے پچاس پچاس ہزار روپے لیے گئے تھے۔ وہ واحد کامیاب اُمیدوار تھا جسے اوم پرکاش کی بدولت پچیس ہزار کی چھوٹ ملی تھی۔ پھر بھی اتنی جلدی رقم اکٹھا کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اس کا چہرہ کمھلا گیا اور وہ منہ لٹکائے باپ کو اپنی ناکامی کا حال سنانے اس کے دفتر پہنچ گیا۔

لکھن کا چہرہ بھی اُتر گیا۔ اسے بڑے بابو کی موت کے ساتھ کندن کی ناکامی کا دُکھ

بھی ستا رہا تھا۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات اُٹھنے لگے۔ وہ سوچوں کی دُھند میں گھرا گھر لوٹ رہا تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک کی ریل پیل تھی۔ جانے پہچانے لوگ سامنے سے یوں گزر رہے تھے جیسے سبھی ایک دوسرے سے بے خبر ہوں۔ ایک جگہ بھیڑ میں اس نے کندن کو آگے بڑھ جانے دیا۔ تبھی سامنے سے ایک تیز رفتار جیپ آ رہی تھی۔ اچانک اس نے سڑک پار کرنے کی کوشش کی اور وہ جیپ کے سامنے آ گیا۔ لگا جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا ہو۔

حالانکہ ڈرائیور کا دھیان اپنی جیپ کی تیز رفتاری سے زیادہ سڑک کی بھیڑ بھاڑ پر مرکوز تھا لیکن یہ سب کچھ اتنا جلدی میں ہوا کہ اسے سنبھلنے اور کچھ سوچنے کی مہلت بھی نہیں مل پائی اور اس نے گاڑی میں بریک لگا دیا۔ اس کے باوجود گاڑی پھسلتی ہوئی دُور گڈھے میں جا گری۔

لکھن دھکے کھا کر چاروں شانے چت سڑک پر پڑا تھا۔ پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔

البتہ بیہوش ہونے سے پہلے اس نے اتنا ضرور دیکھا کہ اسے بچانے کی کوشش میں ڈرائیور اپنا توازن کھو بیٹھا تھا اور گاڑی بے قابو ہو کر اس کے کندن کو روندتی ہوئی گزر گئی تھی۔

OO

ڈوبتی اُبھرتی ریکھائیں

اس دن اپنی نوعیت کا ایک بدترین ریل حادثہ ہوا۔ دو ایکسپریس گاڑیوں کے آمنے سامنے کی ٹکر میں کئی ڈبے ایک دوسرے میں گھس گئے تھے اور کچھ ٹوٹ پھوٹ کر اس طرح پٹریوں سے دُور جا گرے تھے کہ ان میں کسی مسافر کے زندہ بچ جانے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ ایک بھی ڈبہ صحیح سالم نہیں بچا تھا۔ ہزاروں کی جانیں گئیں۔ اس سے زیادہ لوگ زخمی ہوئے۔ مگر سرکار مرنے والوں کا اعداد شمار کرتے ہوئے سو دو سو سے بڑھ کر تین سو پر جا کر اٹک گئی۔ کوئی بھی سرکار ہو ایسے موقعوں پر یہی کرتی ہے۔ لوگ مارے گئے دس تو گنا ایک۔ سو مرے تو دس کی خبر چھپی تا کہ لوگوں کے ذہن پر پڑنے والے نفسیاتی دباؤ سے انھیں بچایا جا سکے۔

لگ بھگ دو بجے کا واقعہ ہے جب سارے مسافر سو رہے تھے۔ اچانک زوردار ٹکر کے ساتھ ایسا زبردست دھما کہ ہوا لگا جیسے سینکڑوں طاقتور بم ایک ساتھ پھٹ گئے ہوں۔ انجنوں کے پرخچے اڑ گئے۔ کئی ڈبوں میں آگ لگ گئی، جو مسافر جہاں لیٹا تھا، سویا تھا وہ وہیں لقمۂ اجل بن گیا۔ ان میں کچھ ہی ایسے ہوں گے جو کسی طرح موت کے منہ میں جانے سے بچ گئے۔

میں اپنے کمرے میں سوئی تھی کہ رات کے آخری پہر فون کی گھنٹی کی آواز پر اچانک میری نیند ٹوٹ گئی۔ کون ہو سکتا ہے بھلا اس وقت؟ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی اور کئی اندیشے من میں اُبھر آئے۔ فون پر گوتم کا دوست پرشانت تھا جس نے مجھے اس اندوہناک ریل سانحہ کی خبر دی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ کل شام جب وہ اس ٹرین کے ایک کمپارٹمنٹ میں گوتم کے ساتھ شلپی کو چھوڑ کر لوٹا تھا تو نہ جانے اس کی من میں اتنی اُداسی کہاں سے سمٹ آئی تھی کہ وہ رات بھر سو نہ سکا۔ اس نے شلپی اور گوتم کی خبر گیری کے لیے خود مجھے جائے حادثہ

پر پہنچنے کی تاکید کی تھی۔ جائے حادثہ میرے گھر سے زیادہ دُور نہیں تھا۔

میں سوچ میں پڑ گئی۔ میری نظروں میں گوتم کا چہرہ گھومنے لگا۔ جسے میں اپنے سراپا کا ہی ایک حصہ مانتی تھی۔ کبھی اسے دوسرا نہیں جانا۔ بچپن میں اس کے ساتھ کھیلتے ہوئے مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ نظروں سے ہوکر دل میں اُترا تو وہ اسی روز تھا۔ جب ایک بار وہ اپنے ڈیڈی ممی کے ساتھ میرے یہاں چائے پر آیا تھا۔

ہم لوگ ایک ہی اپارٹمنٹ کے الگ الگ فلیٹوں میں رہ رہے تھے۔ مجھے یہاں آئے کئی ماہ ہو چکے تھے۔ مگر گوتم کے پاپا چند ہفتے پہلے کہیں سے تبادلہ کرا کر یہاں آئے تھے اور دونوں ہی کوارٹر ملنے کے انتظار میں یہاں ٹھہر گئے تھے۔ نئی جگہوں میں وقت گزارنے کے لیے اچھے لوگوں سے تعلقات قائم کرنے کی ضرورت تو پڑتی ہے۔ شاید اسی خیال سے ممی نے گوتم کی ممی سے کہہ کر انھیں ناشتے پر بلایا تھا۔

میں گوتم کو اپنا کمرہ دکھانے لے گئی۔ وہ شیشے کی الماری میں رکھی ایک ایک شے کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا جو تحفے کی شکل میں میری سالگرہ پر مجھے ملی تھی، جنھیں ممی نے بڑے قرینے سے الماری میں سجا رکھا تھا۔ وہ انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور پوچھ بیٹھا۔

’’کل جب تم میرے برتھ ڈے پر آ ؤ گی تو مجھے کیا دو گی؟‘‘

’’تم جو کہو!‘‘

میں نے یوں ہی کہہ دیا تو اس کی آنکھوں میں شوخی اُبھر آئی اور پیار سے بولا۔ ’’اگر دل مانگ لیا تو؟‘‘

’’دل کیا شے ہے۔ میں تو اپنی جان تمھارے نام کر دوں گی!‘‘

’’ہم لوگ باتوں میں کھوئے تھے کہ ممی کی آواز سن کر ڈائننگ ہال کی طرف چلے گئے۔ ٹیبل پر ناشتہ لگ چکا تھا۔ سبھی میز کے گرد بیٹھ کر ناشتے میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے لگے۔

دوسرے ہی دن میں نے ڈیڈی ممی سے کہہ کر گوتم کو دینے کے لیے ایک خوبصورت سا تحفہ منگوا لیا۔ گھڑی زیادہ قیمتی تو نہیں تھی مگر تھی بڑی خوبصورت۔ برتھ ڈے کے ہنگاموں کے بیچ جب میں نے اس کی کلائی میں گھڑی باندھی تو اس نے کیک کا ایک بڑا سا ٹکڑا میرے

منہ میں ڈال دیا۔ میں شرم سے دوہری ہوگئی اور دل میں ایک عجب سا جذبہ انگڑائیاں لینے لگا۔

مجھے اس بات کا اندازہ تو تھا کہ میرے تئیں اس کے دل میں جو اُنسیت ہے، اس کی کشش مجھے بھی بے چین کیے رہتی ہے۔ کہیں مجھے اس سے محبت تو نہیں ہوگئی۔ اگر یہی محبت ہے تو یقیناً گوتم مجھ سے پیار کرنے لگا ہے ورنہ وہ مجھ سے کیوں پوچھتا۔

''تمھارے بِنا مجھے کیوں ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے اُرملا؟''

مجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ سوچتی ہی رہ گئی اور لڑکپن کے دن بہت تیزی سے گزر گئے، مگر جب جدائی کی گھڑی آئی تب پتہ چلا کہ ہم ایک دوسرے کو کس حد تک چاہنے لگے تھے۔

گوتم کے پاپا ریلوے میں افسر تھے۔ ترقی پا کر عہدہ سنبھالنے دوسرے شہر چلے گئے۔ میرے ڈیڈی ڈاکٹر تھے، جلد ہی ان کا تبادلہ بھی ہوگیا اور ہم لوگ اسی طرح کبھی گاؤں سے شہر اور شہر سے گاؤں کی جانب دوڑتے بھاگتے رہے۔ تیز رفتار زندگی کے ان ہنگاموں میں کس کو اتنی فرصت تھی کہ کوئی کسی کی خبر لیتا۔ پہلے کی طرح دونوں گھرانے ایک دوسرے کے لیے پھر سے اجنبی بن گئے اور کسی راہ و رسم کی ابتدا سے پہلے ہی یہ رشتہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہوگیا۔ مگر گوتم کو میں کبھی بھول نہیں پائی اور نہ ہی گوتم مجھے بھلا پایا۔ دونوں ایک دوسرے کی یادوں کو ذہن میں بسائے الگ الگ دنیا میں جیتے رہے۔

شلپی مجھ سے دو سال بڑی تھی۔ شروع سے ہی نانی نے اسے اپنے پاس رکھا۔ نانا صدر اسپتال میں ہیڈ کمپاؤنڈر تھے۔ آمدنی بہت اچھی تھی۔ شلپی کی دیکھ ریکھ کے ساتھ اس کی پڑھائی کا سارا خرچ پورا کرتے رہے۔

میں نے بی۔اے کر لینے کے بعد پڑھائی چھوڑ دی۔ مگر شلپی ذہن کی تیز تھی اور اسے پڑھائی کا شوق تھا۔ وہ ڈیڈی کی طرح ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ اس کی یہ دلچسپی دیکھ کر نانا نے بھی خاص دھیان دیا اور وہ ایک اچھے سے کوچنگ سینٹر میں داخلہ لے کر میڈیکل میں داخلے کے لیے ہونے والے ٹیسٹ کی تیاری میں جٹ گئی اور اتنا شاندار ریزلٹ آیا کہ کامیاب ہونے والے اُمیدواروں میں اس کا نام سب سے اوپر تھا۔ وہ میڈیکل کالج میں داخلہ لے کر وہیں کالج کے ایک ہوسٹل میں رہنے لگی۔

کالج کے اسی رومان پرور ماحول میں گوتم سے شلپی کی ملاقات ہوگئی۔ گوتم اس کا کلاس فیلو تھا۔ اچھی خاصی شکل وصورت تھی اس کی۔ دونوں ایک ساتھ پڑھتے ہوئے نظریں چار کر بیٹھے۔ گوتم نے پہلی بار شلپی کو دیکھا تو اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے لگا جیسے شلپی کو وہ بہت قریب سے جانتا ہے۔ شاید اگلے جنم میں دونوں ساتھ رہے ہوں۔ بچپن کا کھویا پیار پا کر اس کی زندگی میں جیسے ایک نئی بہار لوٹ آئی اور وہ بے تحاشہ شلپی کی طرف کھنچتا چلا گیا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ دونوں اچھے دوست بن گئے۔ آنکھوں میں خواب پلتے رہے۔ دل کی دھڑکنیں ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرنے لگیں۔ دونوں نے ایک ساتھ زندگی گزارنے کی قسمیں کھائیں اور اس عہد کو نبھانے کے لیے اپنے والدین کو راضی کرنے کا اپنے اندر حوصلہ بھی جٹا لیا اور شلپی اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب بھی رہی۔ اس نے ڈیڈی کی خاموشی میں اپنے سوالوں کا جواب ڈھونڈ لیا۔

اس درمیان شلپی چھٹی میں جب گھر آئی تو اس کے گلے میں ایک خوشنما ہار دیکھ کر میں چونک پڑی۔ میرا تجسس بڑھ گیا اور میں نے ہار کے لاکٹ میں آویزاں وہ تصویر دیکھ لی جو گوتم کی تھی اور مجھے اپنا وہ ہار یاد آ گیا جسے گوتم نے بڑے پیار سے میرے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''دیکھو اُرملا! آئندہ ہم پھر کبھی مل پائیں یا نہیں، یہ ہماری محبت کی نشانی ہے جو ہمیشہ تمھیں میری یاد دلاتی رہے گی!''

ہار کے لاکٹ میں پشت کی جانب گوتم کی تصویر بڑی خوبصورتی سے منڈھی ہوئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شلپی کا ہار سونے کا تھا اور میرے ہار میں چاندی کی چمک تھی۔ اب تک وہ تصویر ماند نہیں پڑی ہے اور میں اسے گلے سے چپکائے ہوئے ہوں۔ کبھی اپنے آپ سے الگ ہونے نہیں دیا۔ گوتم میرے دل کی ہر دھڑکن میں اس طرح بسا ہوا تھا۔ شلپی جب تک گھر پر رہی، گوتم کے جو بھی خط آئے، میں انھیں چوری چھپے پڑھتی رہی اور دو ایک بار تو فون پر ان کی باتیں بھی سن لیں۔ میرا من کڑھنے لگا۔ کئی بار جی میں آیا کیوں نہ اس کانٹے کو اپنی راہ سے ہٹا دوں۔ جس نے میرا پیار چھین کر اس پر اپنا حق جما لیا ہے۔ اسی خیال سے ایک روز میں نے اس کے ناشتے میں زہر ڈال دیا۔ مگر جب میز پر ٹرے رکھ کر اس کے آگے

پلیٹ سجانے لگی تو نہ جانے کیسے طشتری چھوٹ کر فرش پر گر پڑی اور کانچ کے ٹکڑے دُور تک بکھر گئے۔ میں نے جھاڑن سے فرش کو دھو پونچھ کر صاف کر دیا۔

چند دن کی چھٹیاں گزار کر شلپی تو چلی گئی مگر میرے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی چھوڑ گئی اور وقت تیزی سے پرانی یادیں اُجاگر کرتا نظروں کے آگے سے گزرتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شلپی اور گوتم میڈیکل کے آخری سال میں پہنچ گئے۔ تبھی میری زندگی میں ایک بھونچال آ گیا۔ ڈیڈی بلڈ پریشر کے پرانے مریض تھے۔ ایک روز اچانک ان کا بلڈ پریشر اتنا بڑھ گیا کہ ان کے دوست معالج بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ حالانکہ وہ دوا اکثر لیتے رہتے تھے مگر مہینوں سے انھوں نے دوا چھوڑ رکھی تھی اور کوئی احتیاط بھی نہیں برت رہے تھے۔ اچانک بیماری بڑھ گئی تو بہت پریشان ہوئے۔ ممی بھی بہت گھبرائی ہوئی تھیں۔ ان کی گرتی حالت دیکھ کر میں نے شلپی کو تار بھیج کر آنے کو کہہ دیا۔ تار پاتے ہی شلپی نے پہلے تو فون پر ڈیڈی کا حال پوچھا۔ پھر ممی کی خیریت دریافت کی تب گوتم کا تذکرہ کرتے ہوئے بولی۔ وہ اسے بھی ساتھ لے کر آ رہی ہے۔ ابھی سے وہ ہاتھ کا بہت صاف ہے۔ ڈیڈی کے علاج کے دوران تم بھی اسے آزما کر دیکھ لینا۔ اسی بہانے لوٹتے ہوئے دونوں ڈیڈی ممی کا آشیرواد بھی لے لیں گے۔

میں سن رہ گئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ دل کو کیسے سمجھاؤں، گوتم کو کسی اور کے ساتھ دیکھ کر مجھ پر کیا بیتے گی۔ خود کو سنبھال بھی پاؤں گی یا نہیں؟ میں پاگل سی ہو گئی۔ اب گوتم کے آنے میں دیر ہی کیا رہ گئی ہے۔ کسی وقت بھی آ دھمکے گا۔

مگر جس ٹرین سے دونوں آ رہے تھے۔ اچانک راستے میں اس کا زبردست ایکسیڈنٹ ہو گیا اور دونوں کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی اس المناک ریل حادثے کی خبر پورے ملک میں پھیل چکی تھی۔ میں شلپی کے انتظار میں تھی کہ گوتم کے دوست پرشانت کا فون آ گیا۔ میرے حواس اُڑ گئے۔ میں سوچ میں پڑ گئی۔ نگاہوں کے سامنے پرچھائیاں سی لرزنے لگیں۔

جب ٹرین چلی تھی تو کسی کو کیا پتہ تھا کہ یہ سفر کتنوں کی زندگی کا آخری سفر ہوگا۔ آدھی رات کے بعد جب ٹرین اپنی پوری رفتار میں تھی۔ اچانک گوتم کی نیند ٹوٹ گئی۔ اس نے کروٹ بدل کر وقت کا اندازہ لگایا۔ کوئی دو بجے ہوں گے۔ تبھی ایک زبردست دھماکے کے

ساتھ ساری بتیاں بجھ گئیں۔ اسے لگا جیسے آسمان ٹوٹ کر زمین پر گر پڑا ہو۔ وہ لڑھک کر نیچے آ گیا۔ پھر اسے کچھ یاد نہیں۔ جب ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو کھلی فضا میں پایا۔ مگر اس کا سب کچھ اُجڑ چکا تھا۔ شلپی میری طرح ڈبے میں پھنس گئی تھی۔ گیس کٹر سے دروازے اور کھڑکیوں کی سلاخیں کاٹ کر اس کی لاش باہر نکالی گئی۔

میں ڈرائیور کو گاڑی کے لیے کہہ چکی تھی۔ جب کپڑے بدل کر باہر نکلی تو وہ دروازے پر کار لیے کھڑا تھا۔ میں دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تو اس نے بھی اسٹیئرنگ سنبھال کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

جب ہم لوگ جائے حادثہ پر پہنچے تو دُھوپ پھیل چکی تھی۔ بڑا دردناک منظر تھا۔ دیکھ کر میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بوگیوں میں دَبے کچلے پھنسے مسافر اب بھی چیخ چلاّ رہے تھے۔ زخمیوں کی عجیب حالت تھی۔ کسی کا دھڑ تھا تو سر غائب، ہاتھ تھے تو پاؤں نہیں۔ پولیس کے عملے اور فوج کے جوان بچاؤ اور راحت کے کاموں میں جٹے ہوئے تھے۔ فرش پر لاشوں کی قطاریں بچھی ہوئی تھیں۔ میں شلپی کی تلاش میں پاگلوں کی طرح ادھر سے ادھر بھاگ رہی تھی۔ جب وہ کہیں نظر نہیں آئی تو میں نے ڈیوٹی پر تعینات اس المناک حادثے کی تفصیلات نوٹ کرنے والے سرکاری افسر سے دریافت کیا۔ اس کے رجسٹر میں شلپی کی موت کے ساتھ زندہ بچ جانے والے اس کے ہم سفر گوتم کا نام پتہ بھی درج تھا۔ میں حواس باختہ لاشوں کی اس ڈھیر کی جانب بڑھ گئی جہاں بوگیوں سے لاشیں نکال کر کھلی جگہ میں رکھی جا رہی تھیں۔ مجھے شلپی مل گئی۔ فرش پر پڑی لاشوں کے پاس ایک جانب شلپی کی لاش رکھی تھی اور گوتم پاس کھڑا حالات سے نمٹنے کے لیے خود کو تیاّر کر رہا تھا۔ میں لپک کر لاش کے قریب پہنچی اور شلپی کے مردہ جسم سے لپٹ کر رو پڑی۔ گوتم سے یہ رقت آمیز منظر دیکھا نہ گیا۔ اس نے بازوؤں سے پکڑ کر مجھے اپنی طرف گھمایا اور میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔ نگاہیں ٹکراتے ہی گزری یادیں ایک دم متحرک ہو گئیں۔

جب بھی میں گوتم سے کسی بات پر خفا ہوتی تھی تو گوتم اسی طرح میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے منا لیتا تھا۔

OO

احساس کا کرب

''میرے گردے خراب ہو چکے ہیں۔ جینے کی اب کوئی آس نہیں۔ رشتے داروں میں
کوئی ایسا انسان دوست ہے جو مجھے اپنا ایک گردہ دے کر میری جان بچائے؟''
بڑی دردمندانہ اپیل تھی جو تازہ اخبار کے پچھلے صفحہ پر جلی حرفوں میں شائع ہوئی تھی اور
اشتہار کے درمیان سے جھانکتی ہوئی پرتیما کی آنکھیں اسے عجیب نظروں سے گھور رہی تھیں۔
جیسے وہی اس کا مجرم ہے۔ اسے اس حال میں پہنچانے کا ذمہ دار۔ اکھلیش کے تو رونگٹے
کھڑے ہو گئے۔ خوف اور ندامت سے سارا وجود سہم گیا۔
پرتیما بیمار تھی سخت بیمار اس نے دوا لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اس کے دونوں گردے
خراب ہو چکے تھے۔ سانس اور جسم کے درمیان کا رشتہ کب ٹوٹ جائے اس کا کوئی بھروسہ
نہیں۔ روتے روتے اس نے آنکھیں سجالی تھیں۔ نہ کسی سے کچھ بولنا اور نہ کسی کی بات کا
کوئی جواب دینا۔ بس چپ چاپ، اُداس سی کمرے میں پڑی اپنی قسمت کو کوستی رہتی۔
زندگی سے پرتیما کی یہ بے حسی اور لاپرواہی دیکھ کر اکھلیش کا من ڈولنے لگا۔ اگر اسے
کچھ ہو گیا تو سب کچھ گنوا کر اسے بھی کیا چین ملے گا؟
حالانکہ ابھی کچھ ہی دن پہلے کی بات تھی۔ جب پرتیما کے ساتھ اکھلیش کا مختصر سا
خاندان۔ نہایت خوش گوار ماحول میں بڑے اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ سکھ اور آسائش
کی کوئی شے ایسی نہ تھی جو گھر میں موجود نہ ہو۔ کئی کمروں کا خوبصورت فلیٹ۔ ایئر کول
کمرے، سجا سجایا ڈرائنگ روم، اس سے سٹا سونے کا کمرہ۔ بستر ایسا گدے دار کہ آدمی لیٹے
تو دھنس جائے۔ کمرے کی ایک جانب اسٹینڈ پر رکھا ٹیلی ویژن دوسری جانب پردے سے

جھانکتا وی سی آر۔ جب چاہا فلم دیکھی اور کبھی خبریں سننے کا موڈ ہوا تو ٹیلی ویژن کھول دیا۔ کہیں آنے جانے کے لیے نئے ماڈل کی کار۔ مگر اکھلیش تو پریتما کے بغیر گھر سے نکلنا بھی پسند نہیں کرتا۔ پریتما اس کی زندگی تھی۔ اس کے خوابوں کی تعبیر۔ جسے وہ بے پناہ پیار کرتا تھا۔ پریتما بھی اس کی چاہت میں شرابور اس پر جان چھڑکتی تھی۔

زندگی کے شب و روز اپنے دامن میں کائنات کی ساری خوشیاں سمیٹے گزرتے رہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنے سال گزر گئے کہ ان کے بالوں میں اِکّا دُکّا سفیدی نظر آنے لگی اور انھیں زمانے کی رفتار کا کچھ پتہ بھی نہ چلا۔ مگر بعض اوقات انھیں زندگی میں کسی کمی کا احساس ستانے لگتا تھا۔ دونوں اب تک اولاد کے سکھ سے محروم تھے اور یہ تڑپ اور آرزو ہی کچھ ایسی تھی جو اکھلیش کے من میں کنڈلی مارے بیٹھی اسے پریشان کیے ہوئی تھی۔ اکھلیش نے ہر اُپائے کر کے دیکھ لیا۔ پریتما بھی ہار مان گئی۔ تب اس کے دل میں ایک خیال آیا۔ ایسا خیال جسے کہنے کے بعد اسے لگا کہ وہ کہیں جھوٹ بول گئی ہے۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار کہاں کہ کوئی بھی عورت اپنے شوہر کے پیار میں کسی اور کو حقدار بنانا پسند نہیں کرتی۔ مگر اس نے اکھلیش کی خوشیوں کی خاطر نہ صرف اسے دوسری شادی کرنے کا مشورہ دیا بلکہ اس کے لیے ایک اچھی سی لڑکی کھوج نکالنے کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی مگر اکھلیش راضی نہیں ہوا۔

ایک مرتبہ جب اکھلیش اپنے دوستوں کے ہمراہ کہیں شادی کی ایک تقریب میں گیا ہوا تھا۔ از راہِ مذاق کسی نے اسے بانجھ کہہ دیا۔ بات تیر کی طرح اس کے دل کو چھید گئی۔ اسے بڑا قلق ہوا۔ کاش اس کے گھر میں بھی اگر بچّے کی کلکاریاں گونجتیں تو آج اسے کوئی طعنہ دینے والا تو نہیں ہوتا۔ کئی روز تک وہ پریتما کی تجویز پر غور کرتا رہا۔ مگر وہ تو اس کی محبت کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ لمحہ بھر کی جدائی بھی اذیت محسوس ہوتی تھی۔ ایک سکھ کی خاطر پریتما کے پیار کا سودا کرنا اسے کسی بھی حال میں منظور نہیں ہوا۔ مگر انجانے میں ہی اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل گئی جس کا دوستوں نے اپنی مرضی کے مطابق مطلب نکال لیا اور اس کے والدین پر اکھلیش کی شادی کے لیے دباؤ ڈالنے لگے اور آخر کار ان کے اصرار پر اکھلیش کے ماں

باپ کو اس کی دوسری شادی کرنے پر آمادہ ہونا پڑا اور نہایت رازداری کے ساتھ گھر والوں نے اپنے ہی خاندان کی ایک لڑکی پسند کرلی۔ کسی کو کچھ پتہ بھی نہ چلا اور ساری باتیں طے پا گئیں۔

اتفاق سے ایک روز جب پرتیما کئی دن کے لیے اپنے میکے گئی ہوئی تھی نہایت خاموشی اور سادگی کے ساتھ کویتا کے ہمراہ اکھلیش کا بیاہ ہوگیا۔ حالانکہ جو کچھ ہوا۔ وہ اکھلیش کی مرضی کے خلاف تھا، مگر اس نے کوئی مخالفت نہیں کی اور وہ سب کچھ ہوگیا جس کی اس نے کبھی اُمید بھی نہیں کی تھی۔

پرتیما کو پتہ چلتے دیر نہ لگی۔ وہ ذہنی تناؤ اور انتشار کا شکار تو پہلے سے ہی تھی۔ اکھلیش کے اس برتاؤ نے اسے جیسے کہیں سے توڑ کر رکھ دیا۔ یقیناً اکھلیش کے من میں پہلے سے ہی کھوٹ رہی ہوگی ورنہ وہ اسے بتائے بغیر شادی کبھی نہیں کرتا۔ آج اکھلیش اسے اپنے اصلی رُوپ میں نظر آ گیا تھا۔ اس کی پیار کو بانٹ کر اس نے پرتیما کے دل کی دھڑکن کو بے آواز کر دیا تھا۔ اس کی سانسوں کی خوشبو چھین لی تھی۔ پرتیما کو اس سے نفرت سی ہوگئی۔ ایسی نفرت کہ اس کا چہرہ دیکھنا بھی گوارہ نہیں ہوا۔ ان کے درمیان کی اٹوٹ محبت ماضی کی ایک بھولی بسری داستان بن کر رہ گئی اور دونوں ایک دوسرے سے الگ رہ کر بے زار مایوس اور بے کیف زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔

اکھلیش نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی ذرا سی بھول محبت کے اس تاج محل کو بکھرا کر رکھ دے گی جسے دونوں نے بڑی محنتوں سے بنایا تھا۔ اس نے پرتیما کو منانے کی بڑی کوشش کی۔ کئی بار ماں کو سمجھانے اس کے پاس بھیجا مگر وہ نہیں مانی اور نہ اس کے گھر آنے کو تیار ہوئی، جس گھر میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔ وہ اس گھر کی دہلیز پر قدم رکھ کر کیا کرے گی۔ ایسے جینے سے تو اچھا ہے کہ آدمی موت کو گلے لگا کر ساری اُلجھنوں سے نجات پالے۔ اس نے یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ آئندہ اگر اس کی سسرال کا کوئی آدمی اس سے ملنے آیا تو وہ اپنی جان دے دے گی۔

پرتیما کے لیے یہ صدمہ بڑا بھاری اور ناقابلِ برداشت تھا۔ جدائی کے اذیت ناک لمحوں کا اس کی صحت پر بڑا بُرا اثر پڑا۔ وہ فکر و تردد میں گھل کر اپنی جان کو ایک جان لیوا روگ

لگا بیٹھی، جس نے اس کے وجود کو چاٹ کر اندر سے کھوکھلا کر دیا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اس کے دونوں گردے ناکارہ ہو چکے ہیں۔ اب دوا سے کام چلنے والا نہیں۔ پریتما کی جان بچانے کے لیے اس کے گردے کا بدلنا ضروری ہے۔ مگر وہ تو دوا لینے کو بھی تیاّر نہ تھی۔

وقت کی گردش اور حالات کے تھپیڑے نے پریتما کو زندگی سے مایوس اور بے زار کر دیا تھا۔ اس کی ہر خواہش دم توڑ چکی تھی۔ نہ جینے کی تمنا اور نہ مرنے کی فکر۔ اکھلیش کو لگا جیسے وہ کوئی غلط فیصلہ کر بیٹھا ہے اس کی تمام کوششوں کے باوجود بھی جب پریتما ٹس سے مس نہ ہوئی تو ایک روز اس نے اس کے بڑے بھائی سدھیر کو اپنے یہاں بلایا اور پریتما کے معاملے میں اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ کسی طرح پریتما کو لے کر مدراس چلے۔ اسے اس بات کی جانکاری تھی کہ وہاں اسپتال کے کسی ملازم سے مل کر ایسے دلالوں کا پتہ لگایا جا سکتا ہے، جو چوری چھپے انسانی اعضا کا کاروبار کرتے ہیں۔ ان کا اسپتال کے ڈاکٹروں سے بھی کاروباری رشتہ ہوتا ہے۔ اس ہیرا پھیری میں ڈاکٹروں کی خوب کمائی ہوتی ہے اور ضرورت مند مریضوں کا بھی کام چل جاتا ہے۔ اسے یقین تھا گردہ ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔

بڑی مشکل سے پریتما مدراس جانے کو تیار ہوئی۔ سفر کے دوران بھی اس کے بھائی نے بڑی احتیاط سے کام لیا اور مدراس پہنچ کر اسپتال کے قریب ہی ایک ہوٹل کے الگ الگ کمروں میں ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا۔

ہوٹل کے منیجر کا اسپتال کے کئی ڈاکٹروں سے اچھے تعلقات تھے پریتما کو اسپتال میں داخلہ ملنے میں کوئی شواری پیش نہیں آئی۔

ڈاکٹروں نے بھی چیک اَپ کے بعد اس بات کی تصدیق کر دی کہ پریتما کے دونوں گردے خراب ہو چکے ہیں۔ اگر رشتے داروں میں کوئی اسے ایک گردہ بھی دینے کو تیار ہو جائے تو مریضہ کی جان بچائی جا سکتی ہے۔ ورنہ چند روز سے زیادہ اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔

مگر گردہ ملنا آسان نہیں تھا۔ گردے کے لیے کئی دلالوں سے بات چیت کی گئی۔ بھاری رقم کا آفر دیا گیا مگر فوری طور پر گردے کی دستیابی ممکن نہ ہو سکی۔ تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں اور گزرتا ہوا ہر لمحہ آزمائشوں سے بھرا تھا۔ موت پریتما کا پیچھا کر رہی تھی۔ اکھلیش

سے رہا نہ گیا۔ اس نے سوچا۔ زندگی کے اس نازک موڑ پر وہ اس کے کسی کام نہیں آیا تو اس کا ضمیر اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اس نے اپنائیت کے جذبے سے مغلوب ہو کر پر یتما کی جان بچانے کے لیے اپنے ایک گردہ کی پیشکش کر دی۔

گردے کی منتقلی میں ڈاکٹروں کو کئی گھنٹے لگے اور آپریشن کامیاب رہا۔ مگر اکھلیش کے نہ چاہتے ہوئے بھی پر یتما نہ جانے کیسے سب کچھ جان چکی تھی۔ اکھلیش نے اس کامیابی پر جب اسے مبارکباد دی تو پر یتما نے دھیرے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور تشکر آمیز آنکھیں نم ہو کر جھک گئیں۔

○○

خوابوں کی واپسی

بیرا اس کا سامان لے کر اوپر آ گیا۔ وہ اپنی ساڑی سنبھالے اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی اور میں کالج کے لیے تیار ہو کر نکلا ہی تھا کہ راہ داری میں ہم دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ میں اسے یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ میرے چہرے پر حیرت اور مسرت کی لکیریں اُبھر آئیں۔ ماضی کا ایک ایک لمحہ جی اُٹھا۔

اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ میرا ہاتھ تھام لیا اور آنکھوں میں شوخیاں بھر کر بولی۔

''کیا تم واقعی مجھے بھول گئے، یا جان بوجھ کر بھولنے کی کوشش کر رہے ہو؟''

بولنے کا وہی انداز، مسکراتا ہوا چہرہ، شرارتی آنکھیں، دیکھ کر یادوں کی کسک جاگ اٹھی۔ میرا لہجہ اُداس ہو گیا۔

''نہیں کلاوتی! میں تمھیں بھول کیسے سکتا ہوں۔ اتنے سالوں میں ایک پل بھی تو ایسا نہیں گزرا جو تمھاری یادوں سے خالی ہو!''

جواب میں کلاوتی نے کچھ کہنا چاہا۔ تو میں نے اسے روکتے ہوئے پوچھا۔

''تم بتاؤ کیسی ہو؟ اس قدر اچانک اور اتنی دُور کیسے آنا ہوا؟''

''تمھارے بنا زندگی ایک بوجھ بن گئی تھی وشال! جب تڑپ تڑپ کر جینے کا ساہس میں اور نہیں جٹا سکی تو تمھاری تلاش میں ایک روز گھر سے نکل کھڑی ہوئی!''

''میری زندگی کو عذاب میں ڈال کر، ناٹک کا کون سا حصہ باقی رہ گیا تھا جو اب کھیلنے آئی ہو میرے ساتھ؟''

''یقین کرو وشال، وہ میری مجبوری تھی!'' وہ آنسوؤں کو پیتے ہوئے بولی۔

''میں تو کب کا ٹوٹ چکا ہوں۔ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ تمھارے بغیر میں جی سکوں گا بھی یا نہیں؟''

''میں آ گئی ہوں وشال! اب تم اپنی بے چین راتوں کا سارا حساب چکا لینا!''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ کلاوتی میرے اور قریب آ گئی۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اپنے کمرے تک پہنچ گئے۔

پانچ سال اس کی شادی کو ہو گئے۔ پر اب بھی وہ ویسی ہی بنی ہوئی تھی۔ روپ اور نکھار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کی ساری دلکشی اپنی جگہ برقرار تھی۔

بیرا اس کا سامان اپنے سر پر رکھے چپ چاپ کھڑا تھا۔ اسے رکا دیکھ کر کلاوتی اس سے بولی۔ ''دیکھو یہ میرے شوہر ہیں۔ میں انھیں ڈھونڈتی ہوئی یہاں تک آئی ہوں۔ میرا سامان اسی کمرے میں رکھ دو۔ اور ہاں دیکھو، کاؤنٹر پر جا کر منیجر سے کہہ دو کہ میرے نام کا کمرہ وہ کسی اور کو بک کر دے۔ اب ہم دونوں اسی کمرے میں رہیں گے!''

اس نے دس کا ایک نوٹ بیرے کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور وہ سلام کرتا ہوا چلا گیا۔

''یہ تم کیا کر رہی ہو کلاوتی۔ لوگ کیا سوچیں گے؟'' میں نے پنکھے کا سوئچ آن کرتے ہوئے کہا۔

''دوسروں کے جھمیلے میں کسی کو پڑنے کی ضرورت کیا ہے؟ پھر میں نے تو ان کے منہ پہلے ہی بند کر دیئے ہیں!''

وہ کھڑکی کھولتی ہوئی بولی۔ پھر ہم دونوں ایک ہی بستر پر بالکل آمنے سامنے بے تکلف بیٹھ گئے۔ میری انگلیاں دھیرے دھیرے کلاوتی کے ہاتھ چھونے لگیں۔ چند لمحوں بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''سنا تھا کہ تم بڑی سکھی پریوار میں بیاہی گئی ہو اور ایک امیر ملک میں دولت مند شوہر کے ساتھ رہ رہی ہو۔ شاید اب تک دو ایک بچّے کی ماں بھی بن چکی ہو گی۔''

اور بچّے والی اس بات پر وہ زور سے ہنس پڑی اور بولی۔

''یہ بچّہ ہی تھا، جو بڑھ کر ہم دونوں کے بیچ ایک لمبی دیوار بن گیا۔ مکیش کو بچّے کی خواہش

تھی، لیکن وہ اس صلاحیت سے محروم تھا۔ میری مرضی کے باوجود وہ کسی اور کا بچہ لے کر پالنے کے حق میں نہیں تھا۔ کسی اجنبی بچے کو وہ باپ کا اصلی پیار تو دے نہیں سکتا۔ اولاد کی سچی خوشی تو تبھی حاصل ہوگی، جب خون کا رشتہ درمیان میں ہوتا اور یہ مسئلہ ہم دونوں کے بیچ جھگڑے کا واحد سبب بن گیا اور پھر یہ خلیج دن بدن بڑھتی ہی گئی۔ پہلے ہم لوگ الگ الگ کمروں میں رہنے لگے۔ اور پھر الگ الگ کوارٹروں میں چلے گئے اور ایک روز یہ دوری اتنی بڑھ گئی کہ ہم لوگوں نے باضابطہ طور پر علیحدگی اختیار کر لی۔ خوشیوں سے بھری اس زندگی کو تج کر میں ہمیشہ کے لیے تمھارے پاس چلی آئی۔''

''لیکن اتنی دور، کسی اور دیش میں رہ کر اچانک تمھیں یہ کیا ہو گیا۔ تمھیں میرا خیال کیسے آیا؟''

''میں تو تمھارے مزاج سے واقف تھی۔ زندگی کے کتنے حسین لمحات دونوں نے ساتھ گزارے ہیں۔ اسکول سے لے کر کالج آتے آتے ہم لوگوں نے جوانی کی سرحدوں کو چھو لیا تھا۔ کالج کے زمانے میں جب ہمارے قدم ایک ساتھ اٹھ رہے تھے کسی موڑ پر مجھ سے بھول ہو گئی۔ تمھارے پیار کو دولت پر قربان کر دیا۔ دولت کی دیوار نے ہم دونوں کے راستے الگ کر دیئے۔ تم نے بھی میری مشکل آسان کر دی، اور خود کڑوا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ میں دولت مند شوہر پا کر بھی لٹ گئی اور تم دیکھتے رہ گئے۔ تمھارے دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی۔

پہلے تو مکیش رانچی کے ہیوی انجینئرنگ کارپوریشن میں انجینئر تھا۔ جلد ہی بحرین سے اس کی نوکری پکی ہو کر آ گئی تو ہم لوگ وہیں چلے گئے۔

پھر ایک ایک کر کے کئی برس گزر گئے۔ لوگ اکثر آتے جاتے رہتے تھے اور مجھے تمھاری خبریں برابر ملتی رہتی تھیں۔ لیکن صحیح جانکاری تو پورے پانچ سال بعد ہی ملی، شاید تم نہیں جانتے۔ زرینہ میری بچپن کی سہیلی اور میری نجی زندگی کے ہر اُتار چڑھاؤ سے پوری طرح باخبر تھی۔ وہ بیاہ کر اسی شہر میں گئی تھی، جہاں تم رہتے تھے اور جس گلی سے ہو کر تم ہر روز گزرتے تھے اسی گلی کے نکڑ پر اس کا فلیٹ تھا۔ ابھی حال ہی میں جب وہ بحرین آئی تو اس کی آمد کی خوشی میں ہم نے اسے اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا تھا۔ وہ موقع نکال کر مجھ سے

بول گئی۔ ''تم یہاں اپنی ہر رات کو رنگین بنا رہی ہو، اور تمھارا 'وہ' تمھاری جدائی میں بدحال ہو رہا ہے!'' تو میں ہنس کر ٹال گئی۔

''وہ نوجوانی کی ایک بھول تھی جو انجانے میں سرزد ہو گئی۔ اب اسے دہرانے سے کیا فائدہ؟'' بولنے کو تو میں بول گئی، لیکن اس سے میں نے تمھاری ساری جانکاری لے لی۔ تم کہاں رہتے ہو۔ کس کالج میں پڑھاتے ہو۔ چھٹی کے دنوں میں تمھارا کیا شغل رہتا ہے۔ لمبی چھٹیاں کہاں بتاتے ہو۔ کالج کب جاتے ہو، واپسی کب ہوتی ہے؟''

''حیرت ہے، میں تو اس شہر میں ایک اجنبی کی طرح رہتا ہوں۔ گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ بن باس کے یہ پانچ سال میں نے کیسے کاٹ لیے، مجھے کچھ پتہ نہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ مجھے خود کی بھی کوئی خبر نہیں ملتی۔ اب اس ٹھہری ہوئی زندگی کو بیچ منجدھار میں ڈال کر تمھیں کیا ملے گا؟ میں تو پہلے کی طرح اب بھی غریب ہوں۔ کماتا تو اچھا ہوں لیکن جو بچتا ہے وہ غریب بچّوں کی پڑھائی پر خرچ کر دیتا ہوں۔ لیکن تم تو ایک بڑے انجینئر کی بیوی ہو۔ دونوں مل کر لاکھوں کما لیتی ہو گی؟''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تم سے دور رہ کر خوش تھی، تمھاری یادوں کی جوالا مجھے کس طرح جلاتی رہی ہے، اگر تمھیں دیکھنا ہے تو میری آنکھیں تم سے سب کچھ کہہ دیں گی!''

''میری وجہ سے تمھاری زندگی میں کوئی طوفان اٹھے، یہ میں کیسے برداشت کرتا، تمھیں بھولنے کے لیے مجھے خود کو بدلنا پڑا ہے کلاوتی۔''

''مجھے کچھ نہیں چاہیے وِشال۔ اپنے پیار کا صدقہ میری جھولی میں ڈال دو۔ مجھے دنیا مل جائے گی۔''

اس کا گلا رُندھ گیا آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میں بے چین ہو اٹھا۔ وہ چند لمحے رُک کر پھر بولی۔

''میں اپنی صفائی کے لیے کوئی بہانہ نہیں تراشوں گی وِشال! میں جانتی ہوں، میں نے تمھیں بہت دُکھ دیئے ہیں!''

''مجھے کچھ یاد نہ دلاؤ کلاوتی! ورنہ میں....!'' آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

''میں تمھاری مجرم ہوں وِشال! جو سزا چاہو دے دو۔ اُف نہیں کروں گی!''

''تم ناحق پریشان ہوتی ہو۔ میں تو خود بھی اپنے آپ کو بھول چکا تھا۔ جینے کی نئی راہ ڈھونڈلی ہے!''

کلاوتی۔ کے چہرے پر پھیلی مسکان اور لمبی ہوگئی۔ میں چپ رہ گیا۔ کلاوتی کو اپنے اس قدر نزدیک پاکر مجھے لگنے لگا کہ اب میں اکیلا نہیں ہوں۔ اپنے تمام دُکھ بھول گیا۔

ہم لوگ ایک دوست کی طرح رہنے لگے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے پھول سجا کر میں نے اپنا کھویا ہوا پیار پالیا۔ پہلے مجھے جینے کی کوئی آرزو نہیں تھی اور اب میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ تین چار ماہ تو پلک جھپکتے گزر گئے۔ ہمارے برتاؤ میں کوئی فرق نہ آیا۔ زندگی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔

لیکن ایک روز جب سامنے والے کمرے میں کوئی اجنبی آ کر ٹھہرا تو اچانک وہ بے حد پریشان دکھائی دینے لگی۔ آنکھوں میں سوچ وفکر کی ویرانیاں، قدموں میں بے اعتمادی کی لغزش، لگا جیسے کسی اندرونی کرب سے گزر رہی ہو۔

اجنبی بھی دل کا بڑا صاف نکلا اور کسی معمولی ضرورت سے میرے کمرے میں آیا تو ہم لوگوں کو یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ زرینہ کی جان پہچان کا آدمی تھا۔ یہاں وہ کسی ضرورت سے آیا تھا، جس کے لیے کسی ایم. پی کا سفارشی خط بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ منٹوں کی باتوں میں وہ ایسا گھل مل گیا کہ ہم تینوں دوست سے لگنے لگے۔ گھر کا سا ماحول بن گیا۔

لیکن کلاوتی کا خوف کچھ کم نہیں ہوا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں درد کی کون سی کہانی چھپی تھی، میں جان نہیں سکا۔ لیکن مجھے محسوس ہوا جیسے اسے اپنے آپ پر بھروسہ اور اعتماد نہ رہا ہو۔

صبح جب میں کالج جانے لگا تو وہ ہر روز کی طرح مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی اور مسکراہٹوں کے ساتھ مجھے وِداع کیا۔

اور جب میں کالج سے لوٹا تو پانچ بج چکے تھے۔ تھوڑی دیر خاموشی سے میں نے کمرے کے سناٹے میں کلاوتی کو تلاش کیا لیکن ماحول کی اُداسی نے میرے ذہن میں بگولے سے

بھر دیئے۔ سارا ہوٹل ڈھونڈ مارا، جہاں جہاں اس کے ہونے کا شبہ تھا وہاں دیکھ آیا۔ مگر وہ کہیں نہ ملی، شام ڈھلی، رات آ گئی۔ میں اُداس اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ اب مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ایک لمحہ میں نہ جانے کتنی باتیں سوچ گیا۔ کبھی تو ایسا نہیں ہوا کہ وہ مجھ سے کہے بغیر کہیں گئی ہو۔ ساری چیزیں اپنی جگہ درست تھیں۔ پھر اچانک میرا دھیان باہر چلا گیا جہاں مکیش کے دروازے پر ہوٹل کا تالا لٹک رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ اس کے ساتھ کہیں چلی تو نہیں گئی؟ اگر اسے کسی اور کے ساتھ بھاگنا ہی تھا تو پھر میرے پاس کیوں آئی۔ ابھی میں جواب ڈھونڈنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ دھڑام سے کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ بدحواس سی بے تحاشہ بھاگتی ہوئی آ کر مجھ سے لپٹ گئی اور اٹھتی بیٹھتی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

''آج محبت نے دولت پر فتح پالی، جس دولت کے لیے میں نے تمھارا پیار ٹھکرایا تھا اسے ٹھوکر مار کر آج تمھارے قدموں میں پیار پانے لوٹ آئی ہوں وِشال! مجھے معاف کردو۔ میں تمھارے بنا نہیں رہ سکتی!''

''آخر ہوا کیا، جو تم اتنی پریشان ہو رہی ہو؟''

''تم سے آج تک میں نے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی وِشال! مکیش کو تو تم جانتے ہی ہو، وہ کوئی اور نہیں میری زندگی کا ہمسفر تھا۔ میں اس کی خواہش پوری کرنے تمھارے پاس آئی تھی۔ میرے خط کے جواب میں وہ مجھے لینے آیا تھا۔ لیکن میں نے جانے سے انکار کردیا مجھے یہ بات گوارہ نہ ہوئی کہ تمھارے بچّے کا باپ کوئی اور کہلائے۔ اور آج میں وقت اور سماج کے بندھن سے بالکل آزاد اپنی کنواری خوشیوں کے ساتھ تمھارے پاس لوٹ آئی ہوں، مکیش کو ہوائی اڈّے تک چھوڑ کر!''

OO

تلاش

صدیوں سے ایک سوال میرے من میں اُٹھ رہا ہے۔ ایک ایسا سوال جو کسی بدروح کی طرح میرے شعور پر مسلط ہے اور ہر لحظہ میری سانسوں کی رعنائیوں کو چوس رہا ہے۔

لوگوں کی آنکھوں کے کوزے میں روشنیوں کا جو ذخیرہ تھا وہ اس سربستہ راز کو پانے میں صرف ہو چکا ہے۔

اور میں ساحل پر کھڑا سمندر میں ڈوبتے آخری سورج سے آنے والے کل کی پہچان مانگ رہا ہوں مگر مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ جواب کی تلاش میں عمر گھٹتی جا رہی ہے۔ نہ سوال سمٹتا ہے نہ حل کی کوئی صورت نکلتی ہے۔ نگاہیں سمتوں کا طواف کرتی لوٹ آتی ہیں۔ چہرے نظروں سے معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ سب کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں اور حلق سوکھ رہے ہیں۔ ان کا اشارے کنائے میں باتیں کرنا مجھے بڑا ناگوار گزر رہا ہے۔ میں انھیں حیرت اور اجنبیت سے تک رہا ہوں۔ ان کی شک بھری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ یا وہ میری باتوں کا مفہوم نہیں سمجھ پا رہے ہیں۔ دونوں کے درمیان کوئی لاتعلق سی بات ضرور ہے۔ بے چارگی سے میں آسمان تکنے لگتا ہوں۔

مٹیالے بادلوں کی بڑی بڑی بوندیں جب سرمئی آسمان سے اُتر کر پیاسی دھرتی کو سیراب کرتی ہیں تو آدمی کو گیان حاصل ہوتا ہے۔

اس راز کا انکشاف مجھ پر تب ہوا جب بڑی بلندیوں سے کوئی میرے حق میں دعائیں کر رہا تھا اور شہر کی کنجیاں حوالے کر کے میری پیشانی کا بوسہ لے رہا تھا۔

میں نے چاہا اس سریلی آواز کو اُچک کر اپنی جیب میں بھر لوں۔ لیکن تب ہی میں نے

محسوس کیا کہ بونا ہو گیا ہوں۔

اور بونوں کے شہر کے تمام جنگلوں میں ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ دھنواں، حبس اور گھپ اندھیرا۔ شہر شہر، گلی گلی ایک ہی منظر۔ سب کے ایک جیسے حالات کوئی روزی روٹی کے لیے ترس رہا ہے۔ کسی کی آزادی سلب کر لی گئی ہے۔ کوئی اپنے حق کے لیے لڑ رہا ہے۔ سراسیمگی، خوف اور جنگ وجدال۔ سب اپنے اپنے بھاگ کو رو رہے ہیں۔ کوئی کسی کا دُکھڑا نہیں سنتا۔ ہر طبقہ، ہر فرقہ اپنے اپنے قائد کی رہنمائی میں گلیوں گلیوں نعرے لگاتا پھر رہا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں جو بینر ہیں ان پر ان کے مطالبے درج ہیں اور لوگ جو پوسٹر اٹھائے ہوئے ہیں ان پر جلی حروف میں ان کی مانگیں کندہ ہیں۔

بڑے شہروں کی فلک بوس عمارتوں کے سامنے ان کے مطالبے کی حمایت میں پُر جوش مظاہرے ہو رہے ہیں۔ جگہ جگہ احتجاجی جلسے اور جلوسوں کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

بے گھر مزدوروں اور بنا کھیتوں کے کسان جائداد والوں کی فاضل زمینوں پر زبردستی اپنی جھونپڑیاں تعمیر کر رہے ہیں۔

اکثریت اقلیت کے جبر واستبداد سے تنگ آ چکی ہے۔ اب اس کی مزید حکمرانی برداشت کرنے کو وہ تیار نہیں۔ زور آزمائی کے لیے جان ہتھیلی پر لیے سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ اب اس سیلِ رواں کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

قافلے نظروں کے سامنے سے گزرتے جا رہے ہیں۔ میں ایک ایک کو پہچانتا ہوں۔ سب کی مانگیں الگ الگ ہیں لیکن نعرہ سب ایک ہی لگا رہے ہیں۔ انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد!!

کوئی ان کی زبان پر انگارہ بھی رکھ دے تو وہ اپنی آواز سے مکرنے والے نہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ آج بھی دنیا میں کتنے سادہ لوح انسان ایسے ہیں جو اسے غیروں کی زبان کہتے ہوئے نہیں تھکتے۔ الزام تراشی جن کو ورثے میں ملی ہے، مگر اس کی مٹھاس کے ایسے رسیا ہیں کہ اب تک اس کا بدل نہیں ڈھونڈ سکے۔ اسی لیے اپنائے ہوئے ہیں۔

میں روشن آنکھوں اور چمکدار پیشانی والے اس شخص کی کھوج میں نکل پڑتا ہوں جس

نے مجھ سے کہا تھا۔

بھائی سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلا کرتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حکومت کو اپنی باتیں منوانے کو لیے اپنے زرخرید غنڈوں سے کام لینا پڑتا ہے۔

ایک روز جب بڑی مسجد کے پاس سے مورتیوں کا ایک بڑا جلوس گزر رہا تھا، مسجد میں آ کر کئی نوکیلے پتھر گرے اور جب نمازی باہر آئے تو مورتیاں ٹوٹی بکھری سڑک پر پڑی تھیں اور ہزاروں لوگ سڑکوں پر پریشان بھاگ رہے تھے۔

چنگاری کا ہوا میں اُڑنا تھا کہ شہر جل کر راکھ ہوگیا۔ بہت سے لوگ مارے گئے۔ صبح تک سارا شہر اجاڑ لگ رہا تھا۔ کسی بیوہ کی مانگ کی طرح ویران اور سپاٹ۔ سب اپنا اپنا دُکھ لیے بیٹھے تھے۔ کسی کے زخموں پر مرہم کا پھاہا رکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

کہتے ہیں کہ جب کتے کسی اجنبی کو دیکھ کر بھونکنے لگیں تو ان کے آگے ہڈی کا ٹکڑا ڈال دو۔ وہ آپس کی چھینا جھپٹی میں ایسا اُلجھیں گے کہ مسافر آرام سے اپنا سفر جاری رکھ سکے گا۔

وہ بڑا دُور اندیش تھا۔ اس کا کہنا سچ نکلا۔

لوگ اس بات کو بھول گئے کہ وہ کیا سوچ کر نکلے تھے اور ان کے سفر کا مقصد کیا تھا؟ اب میں اپنے اصل قد میں لوٹ آیا تھا۔ تب ہی میں نے دیکھا، چوڑی سڑک کے بیچوں بیچ ایک شخص تنہا چلا جا رہا تھا۔ وہ بڑے لمبے قد کا آدمی تھا۔ میں نے اسے جالیا۔

''بھائی تم مجھے اپنے کاندھے پر اٹھالو کہ میں چاند کو ذرا نزدیک سے دیکھ سکوں!''

''کیا باتیں کرتے ہو؟''

''میں جھوٹ نہیں بولتا۔ سنا ہے کہ چاند کے سفر کو جانے والے ماہرِ فلکیات بڑی دلچسپی سے اس لمبی لکیر کو دیکھنے جاتے ہیں جو چاند کو دو حصوں میں بانٹتی ہے۔ سیاحوں کا قیاس ہے کہ کبھی یہاں سے کوئی نہر گزری ہوگی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس سوکھی نہر میں پانی کا بہاؤ کس سمت تھا۔ شاید مجھے اس بات کا سراغ مل جائے کہ چاند جب کسی کی انگلیوں کے اشارے پر دو ٹکڑے ہوا تھا تو انگلیاں کس رُخ سے کس سمت اٹھی تھیں!''

''واہیات بکتے ہو!''

''میں مقدس کتابوں کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ صدیوں پرانی بات کا جواب

تمھیں چاند کے اس نشان میں ملے گا!''

''کہیں تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا؟'' اس نے ہنسی میں میری بات اُڑا دی اور مجھے تاؤ آ گیا۔ اس سے تکرار ہو گئی۔ کچھ میرے حمایتی جمع ہو گئے۔ کچھ اس نے اپنے آدمیوں کو اکٹھا کر لیا۔ اور دو بدو جھڑپیں ہونے لگیں۔

اور پھر بڑی پابندی کے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ کبھی کرفیو میں ڈھیل دی گئی۔ کبھی اضافہ کیا گیا۔

کوئی کنویں میں مرا ہوا پایا گیا۔ کوئی سڑک کے کنارے گندے نالے میں مردہ ملا۔ کسی کو چھرے کے زخم آئے کوئی بم کے دھماکوں میں گھائل ہو کر اسپتال پہنچا۔ اور ایک روز ایسا بھی ہوا کہ بہت سے دنگائیوں نے کئی بستیوں کو تہس نہس کر ڈالا۔ اتنے لوگ مارے گئے کہ شمار مشکل ہو گیا۔ نہ کوئی زندہ بچا اور نہ کسی کو اس کی صحیح تعداد معلوم ہو سکی۔

ہر طرف بے ایمانی اور نسل کشی کا بازار گرم تھا اور تعصب کی آندھیاں بڑی تیز تھیں۔ جس کے آگے بڑے سے بڑے تناور درخت کی حیثیت بھی خس و خاشاک سے زیادہ نہیں تھی۔

کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ میرے بھی حمایتی ناجائز طور پر میرے ساتھ رہ رہے ہیں۔ اب ہم انھیں اپنے گھروں میں رہنے نہیں دیں گے۔ ہمارے شہر کی سرحدیں پڑوس کے ایک ملک سے ملتی تھیں۔ گو کہ بٹوارے نے خاندانوں کو الگ کر دیا تھا اور سرحدوں پر فوجی چوکیاں قائم تھیں، مگر ہماری زبان مشترک تھی اور ہم بنا کسی روک ٹوک کے ایک دوسرے کے یہاں آتے جاتے تھے۔

ہمارے یہاں تیل کے کنویں اور چائے کے باغات تھے۔ آب و ہوا اچھی تھی اور روزگار کے قدرتی وسائل موجود تھے۔

بٹوارے کے بعد ہی سرحد پار سے کچھ لوگ یہاں آ بسے تھے اور اکثر بے کار لوگ روزگار کی تلاش میں یہاں آتے رہتے تھے۔ ان میں سے کچھ نے تو یہاں کی بود و باش اختیار کر لی اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ رفتہ رفتہ انھیں بھی وہ سارے حقوق حاصل ہو گئے جو یہاں کے قدیم باشندوں کو حاصل تھے۔

کئی دہائیاں گزر گئیں۔ آبادی بڑھتی گئی۔ تازہ مردم شماری نے لوگوں کا دھیان اپنی

طرف کھینچ لیا۔ ہماری تعداد انھیں اکھرنے لگی اور وہ ہمیں یہاں سے نکالنے پر آمادہ ہو گئے۔

مگر میرا دعویٰ تھا کہ ہمارے آباواجداد تو یہاں کے صدیوں پرانے باسی ہیں۔ وہ یہیں پیدا ہوئے۔ مرے اور دفن بھی یہیں ہوئے۔ ہم اپنی میراث چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ یہ میرا پیدائشی حق ہے اور مجھے میرے اس حق سے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔

میری باتیں سن کر وہ آگ بگولہ ہو گیا اور بولا۔

''تم اپنے کو اس کا حقدار سمجھتے ہو۔ اب ہم زبان کے نام پر اپنے گھر کے اور ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے۔ تم چوری چھپے گھس آئے ہو۔ تمھیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

جو بات زبان سے نکل گئی۔ وہ پتھر کی لکیر بن گئی۔ میں اپنے دعوے سے ہٹنے کو تیار نہیں ہوا۔ میرے حمایتی بڑی تعداد میں میرے ساتھ تھے۔ میری شکایت تھی کہ تم مجھے بہت ستا چکے۔ ہم اپنے گھروں میں بے آسرا ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب میں اور مرنے کو تیار نہیں۔ میں اپنی مرضی کا آپ مالک ہوں۔ اسی دھرتی پر جہاں میں رہ رہا ہوں وہ میرا گھر ہے۔ مجھے یہاں سے کوئی بے دخل نہیں کر سکتا۔

کوئی مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آیا۔

ہم کئی حصوں میں بٹ گئے۔ ہمارے گرم مزاج نوجوانوں نے اپنی ایک الگ تنظیم بنا ڈالی تو اس کے جوشیلے نوجوانوں نے بھی ہتھیار اٹھا لیے۔

لوٹ مار اور غارت گری کا سلسلہ شروع ہوا تو پھیلتا ہی چلا گیا۔ دن کے بے رنگ اُجالے اور رات کی خوفناک تاریکی میں موت ناچتی رہی۔ بے گور و کفن لاشیں، جن کی پہچان بھی مشکل، ندی اور نالوں میں پڑی تعفن پھیلاتی رہیں۔ انھیں ٹھکانے لگانے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ہر لمحہ خوف — اور ناگہانی کا خدشہ — کب کیا ہو جائے کوئی کچھ نہیں جانتا۔

وقت یوں ہی گزرتا رہا۔ رفتہ رفتہ کئی سال بیت گئے۔ کچھ بھی نہیں بدلا۔ سب کچھ یوں ہی چلتا رہا۔

لیکن اندھیرے سے اُجالا پیدا ہوتا ہے۔ اور اُجالے کی آخری کرن جب دم توڑتی ہے تو اندھیرا وجود میں آتا ہے۔

ایک روز اچانک اس کے قائد کے رویے میں کچھ تبدیلی نظر آئی۔ وہ بڑا نرم رُخ اپنائے

ہوئے تھا۔ اس کے قائد نے مجھے ایک راہ بجھائی اور ہم دونوں اس کی کوٹھی کے ایک پُرسکون کمرے میں بیٹھ گئے۔

دیر تک دنیاوی مسائل پر باتیں ہوتی رہیں۔ بہت سے موضوعات زیرِ بحث آئے۔ کچھ میں نے اپنا دُکھڑا سنایا۔ کچھ اس نے اپنی آپ بیتی دُہرائی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں سارا وقت گزر گیا۔ اور جب ملاقات کی آخری گھڑی آ پہنچی تو اس نے کہا۔

''بھائی کیوں نہیں ہم لوگ اپنا ماضی بھول جائیں اور مل جل کر رہیں۔ اتحاد میں طاقت ہے!''

بات بڑی صاف اور کھری تھی اور وقت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اس کی بات مان لی جائے اور ایک منصوبے پر ہم نے سمجھوتہ کرلیا۔ بڑے ڈرامائی انداز میں لوگوں نے میل ملاپ کی یہ خبر سنی۔ اس فیصلے سے جہاں سبھی خوش تھے ایک بڑا طبقہ ناراض ہوگیا۔

میں نے معاملہ درگزر کردیا کہ چلو جینے کے لیے شانتی ضروری ہے۔ بارود کے ڈھیر پر بیٹھا آدمی کب تک زندگی کی خیر منائے۔

لیکن اس کی ناراضگی بہت بڑھ گئی۔ قائد نے اسے سمجھانے کی بڑی کوشش کی۔ سخت دباؤ ڈالا مگر بے اثر رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ انصاف کرنے والوں نے اس کے ساتھ بڑی بے انصافی کی ہے۔ مخالف لوگوں کو غیر ضروری مراعات دے کر ان کا منہ چڑایا ہے۔

اس نے معاہدے کو سرِ عام پھاڑ ڈالا اور عدولِ حکمی شروع ہوگئی۔ ایک بار پھر لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ ہڑتالیں ہونے لگیں۔ بازاروں اور درسگاہوں میں اُداسی لوٹنے لگی۔ فضائیں ماتم کناں بن گئیں۔ خون آگیں منظر میں سب کچھ ڈوب گیا۔

سوچتا ہوں۔ آخر اس میں نفرت کا انجام کیا ہوگا۔ گھروں کی شانتی کب لوٹے گی۔ آنگن کا اُجالا کیسے کھلے گا۔ اندر تاریکی اور باہر گھپ اندھیرا۔

اس بے یقینی حالات کو پُرامن بنانے کے لیے شاید وقت کو کسی مسیحا کی تلاش ہے۔ روشنی کی خاطر۔ روشنی کے لیے تلاش۔ پیہم تلاش!!

OO

اَن دیکھے خوابوں کی تعمیر

طویل جدوجہد اور لمبے انتظار کے بعد یہ موقع مجھے نصیب ہوا تھا۔ گھر لوٹنے کی خوشی کسے نہیں ہوتی؟ ایک عرصہ تک خیموں کے شہر میں خانہ بدوش کی طرح زندگی گزارنے کے بعد جب جہاز نے اُڑان بھری تو مجھے شہر چھوڑنے کا ملال تو ضرور ہوا مگر خوشی بھی ہوئی کہ اب ہم پوری طرح آزاد تھے۔ ہمیں ذہنی پریشانیوں سے نجات مل چکی تھی۔ میرا دل اس دھرتی کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا جس کی مٹی سے ہماری زندگی کی ہر آس جڑی ہوئی تھی۔

جہاز بڑی تیزی سے اپنی منزل طے کر رہا تھا۔ مگر ڈھیر ساری یادیں اس سے بھی زیادہ تیزی سے میرے ذہن میں رقص کر رہی تھیں۔

مجھے بچپن کا وہ زمانہ یاد آ رہا تھا۔ جب ہم ہاتھوں میں پرچم تھامے آزادی کی لڑائی لڑنے سڑکوں پر اُتر آئے تھے اور زندگی داؤں پر لگا دی تھی۔

غلامی سے نجات پانے کے لیے ہم نے کیا کچھ نہیں کیا۔ بن باس کے دُکھ جھیلے، کالے پانی کی سزا کاٹی، دار پر چڑھائے گئے تب کہیں جا کر ملک آزاد ہوا۔

صدیوں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد ہم نے آزادی کی لڑائی تو جیت لی، مگر مات کھانے والوں نے اپنی شکست کا بدلہ لے لیا۔ ملک کے حصے بخرے کر کے ہماری صورت ہی بگاڑ دی اور ہمارے درمیان اختلاف کی ایک ایسی بیج بو دی جس نے ہمیں دائمی کرب اور کسک میں مبتلا کر دیا۔

آزادی کا سورج طلوع ہوا مگر ہماری قسمت ہی کھوٹی نکلی۔ بادِ سموم کے ایک ہی جھونکے

میں نہ جانے کتنے گھر تباہ ہوگئے۔ برباد ہونے والوں میں میرا آشیانہ بھی شامل تھا۔ اپنے بے گانوں کی طرح بے مروّت ہوگئے۔ جان پہچان کے لوگوں نے ہی میرا سب کچھ لوٹ لیا۔ جب جان و مال، عزّت و آبرو کچھ بھی محفوظ نہیں رہی تو ہم نے گھربار چھوڑنے کا ارادہ کرلیا اور لمبی مسافت طے کرنے کے بعد پڑوس کے ملک کی ایک بڑی سی بستی میں ایک چھوٹا سا مکان لے کر رہنے لگے۔

مقامی لوگوں نے بڑی فراخ دِلی دکھائی۔ ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہمسائیگی کا حق ادا کرتے ہوئے انھوں نے ہمارے سروں پر خوف و ہراس کے جو بادل منڈلا رہے تھے۔ اسے ذہن سے کھرچ کر نکال دیا اور ہم نے اطمینان کی سانس لی، مگر شاید ہمارے نصیب میں سُکھ نہیں تھا۔

ہماری زبان اردو تھی اور مقامی باشندے بنگلہ بولتے تھے، جس کی باعث یہاں ہجرت کر کے آنے والوں کی ذات کو ایک نئی پہچان مل گئی۔ ہمیں بہاری کے خطاب سے نوازا گیا۔ رفتہ رفتہ زبان کے اس فرق نے لوگوں کی ذہنیت بدل ڈالی اور وہ ہمیں ایک بوجھ سمجھنے لگے۔ انھیں یہ فکر ستانے لگی کہ کہیں ایک دن ہمارے آگے ان کی حیثیت کمزور نہ پڑ جائے اور میں ان کی مرضی کا مالک بن جاؤں۔

ان میں برتری کا احساس جاگ اُٹھا اور لوگ جانب داری سے کام لینے لگے۔ جب تنگ نظری اور اختلاف کے گھٹے گھٹے ماحول میں جینا مشکل ہوگیا تو ہم ذاتی جھگڑوں میں اُلجھ پڑے۔ آپسی رقابت نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ جس دھرتی کو ہم اپنا وطن سمجھ کر آئے تھے، یہاں رہ کر مصیبتوں کی داستان اور بھی لمبی، دردناک اور غمگین ہوگئی۔

پل پل گزرنے والا وقت، مہینے اور سال میں بدل کر پیچھے کی اور بھاگتا رہا۔ ان تبدیلیوں کے ساتھ حالات نے بھی اپنی چولیاں بدلیں اور تیسری دہائی شروع ہوتے ہی زندگی ہنگاموں کی نذر ہوگئی۔ ایک بار پھر ہمیں اُجڑنا پڑا۔ ہم اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے۔ دھن دولت زمین جائداد سب پر دشمنوں نے قبضہ جمالیا۔ ہم تہی دست ہوگئے۔ زندگی دھند کی لپیٹ میں آگئی۔ ہماری مجبوریوں نے ہمیں بے آسرا کردیا تو جان بچانے کی خاطر کیمپوں

میں رہنا پڑا۔ علاقے کی وہ بستیاں جہاں پہلے سے بہاری آباد تھے خیموں کا شہر بن گئیں۔ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے بہاریوں کو بھی لا کر خیموں میں ڈال دیا گیا۔ نفرت اور حقارت بھرے ماحول میں زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی۔ لوگ روٹی اور کپڑے تک کو محتاج ہو گئے۔ ہم اپنے ہی گھروں میں نظر بند ہو گئے۔ ہمارے لیے آزادی کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔

دو دہائی کا وقفہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ تاریخ بنتے اور بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ حالات بدلے اور وقت نے ایک بار پھر انگڑائی لی تو دنیا کے نقشے پر ایک نئے ملک کا وجود عمل میں آ گیا۔ رفتہ رفتہ جنگ کے بادل چھٹے۔ دھرتی خون پی کر سبزہ اُگانے لگی، مگر کیمپوں میں پڑے بہاریوں کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

حالانکہ دنیا ان کے دُکھوں سے غافل نہیں تھی۔ قومی اور ملّی ادارے ان کے دُکھ درد کو بانٹنے کی سعی کر رہے تھے۔ کچھ بیرونی اور بین الاقوامی تنظیمیں بھی سرگرم عمل تھیں۔ اُجڑے ہوئے لوگوں کی باز آبادکاری کا مسئلہ ان کے سامنے تھا۔ ان کی کوششیں بار آور ہو رہی تھیں۔ بہاریوں کی ایک بڑی تعداد کو ان کے اپنے وطن میں بسایا جا چکا تھا اور جو بچے تھے وہ بھی جانے کی آس لگائے بیٹھے تھے اور گزرتے وقت کے ساتھ وطن لوٹنے کی بے پناہ آرزوؤں کو تھپکیاں دے کر خیموں کے سائے میں سلا رہے تھے۔

میں بھی اپنے چھوٹے سے خاندان کے ساتھ کیمپ میں پڑا اپنی باری کا منتظر تھا۔ جہاں ایک ایک پل گزارنا مشکل لگتا تھا وہاں انتظار میں بیسیوں سال گزر گئے۔ کیمپ میں ہی دو بچّے جوان ہو چکے تھے۔ بڑی لڑکی کی شادی بھی اسی ماحول میں انجام پائی تھی اور چھوٹا لڑکا کیمپ کے ہی ایک کالج میں پڑھ رہا تھا۔

مجھے انتظار کا ایک طویل دُکھ جھیلنا پڑا۔ ایک زندگی گزارنے کے بعد جب قرعہ میرے نام نکلا تو میری خوشیوں کی کوئی انتہا نہ رہی۔ خالص انسانی بنیاد پر مختلف بین الاقوامی تنظیموں کی جانب سے کئی جہاز مہیا کیے گئے جن میں سوار ہو کر ہم وطن کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ بے حد تھکا دینے والی مسافرت کے بعد جب جہاز ہوائی اڈے پر اترا تو ہم اپنے آپ کو

بالکل تازہ دم محسوس کر رہے تھے۔

ہم وطن پہنچ کر بے حد خوش تھے۔ مسرت و شادمانی سے ہمارا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ ایک بڑی سی کالونی میں دو کمروں کے ایک چھوٹے سے فلیٹ کی ملکیت اوروں کی طرح مجھے بھی سونپی گئی، جس کے دروازے پر میں نے اپنے نام اور پتہ کی تختی لٹکا دی۔

ایک بار پھر ہم نے ہونٹوں پر مسکراہٹیں سجالیں۔ یاس اور نا اُمیدی میں ڈوبی ہوئی یادوں کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ چہرے پر خوشی لوٹ آئی۔ گھر بار لٹنے اور سب کچھ کھو دینے کا غم آہستہ آہستہ ہلکا ہونے لگا۔ کئی دنوں تک فلیٹ کو سجانے اور سنوارنے میں لگے رہے۔ جب پاس پڑوس والوں سے جان پہچان ہوگئی تو اجنبی شہر میں اپنوں کو ڈھونڈنے اور غیروں سے رشتے قائم کرنے کی فکر ہوئی۔

جب سے ہم لوگ اس بستی میں آئے تھے کہیں آنے جانے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ کئی دنوں سے بچّے بھی شہر کو دیکھنے کی ضد کر رہے تھے۔ خود میرا دل بھی مچل رہا تھا۔

آخر ایک روز وقت نکال کر ہم نے شہر گھومنے کا پروگرام بنایا۔ ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور بچوں کو ساتھ لے کر گھومنے نکل پڑے۔

کشادہ سڑکوں کی دونوں جانب فلک بوس اور پُر شکوہ عمارتیں کھڑی تھیں۔ چکنی اور چمکیلی شاہراہوں کے ساتھ فٹ پاتھ پر راہ گیر چل رہے تھے۔ بعض چوراہے پر لوگوں کی بھاری بھیڑ اور ٹرافک کی لمبی قطاریں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ہم شہر کے کسی مصروف ترین علاقے سے گزر رہے ہیں۔

گاڑی اپنی سبک رفتاری کے ساتھ ہمیں تفریح گاہوں، شاہی محلات اور قدیم عمارتوں کی سیر کراتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔ بچّے ایک ایک چیز کو حیرت سے تک رہے تھے اور پوچھ رہے تھے۔ ڈرائیور کو جتنی جانکاری تھی وہ کسی سلجھے ہوئے گائڈ کی طرح ہمیں سب کچھ بتائے جا رہا تھا۔

راستے میں ایک جگہ میں نے چائے کی طلب محسوس کی تو ڈرائیور نے ایک بڑا سا ہوٹل

دیکھ کر گاڑی روک دی اور اسے پارک کر کے ہم لوگ چائے پینے اندر چلے گئے۔

ہوٹل میں بھیڑ تھی۔ بیرے کو ناشتہ لگانے اور چائے صرف کرنے میں کافی دیر ہو گئی، مگر کسی اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوا۔ باہر کی بہ نسبت اندر کی نرم ہوا ہماری تھکاوٹ کو دُور کرنے میں معاون ثابت ہوئی اور جب ہم چائے سے فارغ ہو کر نکلے تو باہر کی فضا ایک دم سے بدلی ہوئی تھی۔ ہر شخص بدحال تھا۔ لوگ افراتفری کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ معلوم ہوا شہر میں دنگا ہو گیا ہے۔ دنگے کی نوعیت ہمیں معلوم تھی۔ پھر بھی میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ سا گیا۔

دنگا اپنی پرانی نوعیت کا ہی تھا۔ پہلے پٹھان اور مہاجر کے دو غنڈے کسی بات کو لے کر آپس میں لڑ پڑے۔ ایک مارا گیا۔ دوسرے کو شدید چوٹ آئی۔ پھر کیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے حمایتی آپس میں دست و گریباں ہو گئے اور ایک معمولی جھگڑا بڑے دنگے میں بدل گیا۔

جس بات کو لے کر ہمیشہ بہاری اور بنگالی آپس میں لڑتے رہے، اس نظریاتی اختلاف کو لے کر یہاں بھی پٹھان اور مہاجروں کے بیچ لڑائی جاری تھی۔

ڈرائیور بنگالی تھا۔ اسے پٹھان اور مہاجروں کے بیچ ہونے والے دنگے کی اصلیت معلوم تھی۔ اسے پتہ تھا کہ پچھلے دو ایک دن سے یہاں کے حالات بے حد کشیدہ تھے۔ کسی وقت بھی کچھ ہو جانے کا خطرہ بنا ہوا تھا۔ وہ عجب دُبدھے میں پڑ گیا۔ گو کہ اسے راستے کئی معلوم تھے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کون سا راستہ خطرناک ہے اور کس گلی سے بنا کوئی خطرہ مول لیے گزرا جا سکتا ہے، مگر اسے بڑی پریشانی ہو رہی تھی۔ اس نے کسی سے کچھ پوچھے بنا گاڑی ایک پیچیدہ راستے پر ڈال دی اور اُلٹی سیدھی رفتار میں اسے بھگانے لگا۔ ایک جگہ تو گاڑی بے قابو ہوتے ہوتے بچی۔ اُلجھے ہوئے راستوں سے گزر کر جب ہم کالونی جانے والی سڑک پر نکلے تو ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ دُور سڑک کے کنارے پل کے قریب کئی لوگ مشتبہ حالت میں گھوم رہے تھے۔

ڈرائیور ہوشیار تھا۔ اس نے گاڑی اُلٹے ہاتھوں گھمائی اور جونہی ہم سڑک سے مڑ کر گلی

میں داخل ہوئے، ہم پر تابڑتوڑ گولیاں برسنے لگیں، مگر قسمت اچھی تھی، بچ گئے۔ بھاگتی ہوئی کار کے پیچھے ایک بم بھی پھٹا۔ خوف کے مارے ہمارا دم گھٹا جا رہا تھا۔ حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔ بچوں کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔ بڑا بیٹا اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ڈر کر ڈرائیور کے اور قریب ہو گیا۔

گاڑی پھر پکی سڑک پر بھاگنے لگی۔ شاید خطرہ ٹل چکا تھا۔ ہم دم سادھے اپنی سیٹوں سے چپکے بیٹھے رہے۔ کچھ دُور جا کر اس نے ایک نیا راستہ اپنایا اور گاڑی کچّے راستے پر ڈال دی اور پھر جھاڑیوں کے پار والی سڑک سے ہوتی ہوئی کالونی کی جانب موڑ دی۔ تب ہی ایک بوسیدہ سے مکان سے گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ نشانے باز پڑا پکّا تھا۔ وِنڈشیڈ کا شیشہ توڑ کر ایک گولی اندر آئی اور ڈرائیور کی گردن کو چھیدتی ہوئی پار نکل گئی۔ پاس بیٹھا لڑکا بھی زخمی ہو گیا۔ ڈرائیور کے ہاتھ ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ اس کا سر اسٹیئرنگ پر لڑھک سا گیا اور گاڑی کئی جھٹکے کھا کر ایک درخت سے جا لگی۔

موت ہماری آنکھوں میں ناچنے لگی۔ زندگی دیے کی لو کی تھرتھرا رہی تھی۔ اب ہمیں مرنے سے کوئی بچا نہیں سکتا تھا۔ اتفاق سے پولیس کی ایک جیپ کہیں پاس سے گزر رہی تھی۔ آواز سن کر ہماری مدد کو آ گئی۔ زخمیوں کو باہر نکالا گیا اور پولیس ہمیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر زخمیوں کو بھرتی کرانے اسپتال لے گئی۔

ڈرائیور بڑا سخت جان تھا۔ زخموں سے کافی خون بہہ جانے کے بعد بھی نبض باقی تھی۔ اسے ایمرجنسی وارڈ میں لایا گیا، جہاں آپریشن کے دوران اس کی جان نکل گئی۔

لڑکے کا زخم معمولی تھا۔ مرہم پٹّی کے بعد گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ پولیس کا ایک دستہ ہمیں کوارٹر تک چھوڑ آیا۔ گھر پہنچ کر ہم وسوسوں میں گھر گئے۔

شہر کئی جگہوں سے جل رہا تھا۔ دُھویں ماحول کی کساوٹ بڑھا رہے تھے۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ بچّوں کی گھبراہٹ اور پریشانی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ سارا گھر بھائیں بھائیں کرتا نظر آ رہا تھا۔ غمزدہ اُداسی دہلیز سے لگ کر اونگھ رہی تھی۔

جلدی جلدی ہم نے فلیٹ کے سبھی دروازے بند کیے اور بھاگ کر چھت پر آ گیا۔

دُور تک سارا منظر لہولہان تھا۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہم نے جس سکھ کو پانے کے لیے دنیا بھر کے دُکھ جھیلے تھے، سب کچھ گنوا کر سپنوں کا ایک محل سجایا تھا، لیکن اپنی ہی دھرتی پر سکھ کی سانس لینا مجھے نصیب نہیں ہوا۔ ہر جگہ ایک ہی فتنہ سر اٹھائے کھڑا تھا۔

کہیں شیعہ سنّی میں ٹھنی تھی تو کہیں پٹھان اور مہاجر آپس میں دست و گریباں تھے۔ دن بدن کشیدگی بڑھتی ہی جا رہی تھی اور حالات غیر یقینی بنتے جا رہے تھے۔ کئی نسلوں کا دُکھ بھوگنے کے بعد آج بھی آدمی اپنے ہی گھروں میں خود کو محفوظ نہیں سمجھ رہا تھا۔

ایک ذرا سی بھول کی اتنی بڑی سزا؟ میں تو اپنے اندر جینے کا حوصلہ بھی جٹا نہیں پا رہا ہوں۔

گھر بار چھوڑ کر تو ساری عمر بہاری کہلاتے رہے، مگر اب اپنوں کے درمیان رہ کر بھی کیا مہاجر ہی بنا رہوں گا؟ مگر کب تک؟ آخر کب تک؟

OO

وقت کا خدا

جب آدم کا پتلا بن کر تیار ہو گیا تو فرشتوں کو حکم ہوا کہ تم اسے سجدہ کرو۔ فرشتے سجدہ ریز ہو گئے۔ لیکن ان کے سردار نے لب کشائی کی۔

''الٰہی ہم تو آگ سے بنائے گئے ہیں، مٹّی کے پتلے کو سجدہ کیسے کریں؟''

ابلیس اپنی اس نافرمانی پر راندۂ درگاہ ہوا اور خدا نے اسے حیاتِ جاودانی بخش کر بے پناہ قوت کا مالک بنا دیا۔ لیکن لعنت اس کا مقدّر بن گئی۔ اس نے آدم کو ورغلا کر جنّت سے نکلوایا اور زمین پر آ کر اسے قتل کا شعور پیدا ہوا۔ ہابیل نے ایک عورت کے لیے اپنے بھائی قابیل کی جان لے لی۔

جوں جوں دنیا کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا، ابلیس نے بھی اپنے بال و پر نکالنے شروع کر دیئے۔ جلد ہی وہ لوگوں کے اژدہام میں اس طرح گھل مل گیا کہ اس کی پہچان مشکل ہو گئی۔ کچھ تو انسانی زندگی کے رگ و ریشے میں سرایت کر گئے اور اپنی قربت کا سایہ ہر انسان کے کاندھے پر مسلط کر دیا۔ لوگوں کے درمیان رہ کر اس نے انھیں بہکانے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اس کی عدول حکمی رنگ لائی اور خدا کی بستی میں فتنہ و فساد برپا ہونے لگا۔

روز افزوں بڑھتا ہوا ہنگامہ، قتل و غارت گری، حسد اور نفرت کی آگ میں جھلستا ہوا انسانی بدن، ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتا ہوا آدمی کا وجود، ریزہ ریزہ ہو کر فضاؤں میں منتشر ہونے والی انسانیت، اجل کی صدا لگا کر کتنوں کو بے صدا کرنے والے ناعاقبت اندیشوں نے اپنے ارادوں کو زنگ آلود دیکھ کر اپنی کشتیاں گھما لیں گے کہ زنگ آلود قفل کھولنے کے لیے ہتھوڑے کی ضرورت پڑتی ہے اور کوئی بھی ہتھوڑے کی ضرب کھا کر اپنی پیشانی کو لہولہان

ہونے نہیں دے گا۔

ہوا یوں کہ انجانی سمتوں کے مسافر نے اپنی راہ بدل لی۔ لیکن دیکھنے والی نگاہوں نے اسے اپنے طور پر دیکھا۔

اچھا پھول حاصل کرنے کے لیے گلاب کے پودوں کو ہر سال چھانٹا جاتا ہے کہ نئی ٹہنیوں میں اُگنے والے پھول عمدہ اور تیز خوشبو دیتے ہیں۔

آدمی چاند پر پہنچ کر سورج کی تسخیر میں لگا ہوا ہے۔ کائنات کا کوئی بھی علاقہ اس کی زد سے باہر نہیں۔ مگر آدمی حالات کے سامنے کس قدر مجبور اور بے بس ہے۔ اکھڑی ہوئی سانسوں کو دم توڑنے سے روک نہیں سکتا۔ موت کے انتظار میں گھڑیاں گننے والوں کے ہونٹوں سے چرائی ہوئی مسکراہٹیں ان کے لبوں پر دوبارہ سجانے کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی ہے۔ تب لوگوں کی نگاہیں مشیت کی جانب اُٹھ جاتی ہیں کہ وہ قادرِ مطلق ہے۔

لیکن شیطان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

اونچے آدرشوں کی پہچان بن کر جینے کی آرزو میں لوگ خود فریبی کے پھندوں میں ایسا اُلجھتے ہیں کہ اپنے گرد کے حصار کو توڑنا ان کے بس میں نہیں ہوتا اور جب ان کی کھوکھلی دلیل کا بھرم کھلتا ہے تو اپنے ننگے پن کو چھپانے کے لیے مصلحت آمیز بے بنیاد بہانے تراش کر اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا دیتے ہیں۔

قدیم تاریخی شہر کے آباد چوراہے پر جب جرم کش دوائیں تیار کرنے والی ایک بدیسی فیکٹری بن کر تیار ہو گئی تو چند لوگوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔

شہر کی فضا کو مکدّر ہونے سے بچایا جائے۔

تب فیکٹری کے ذمہ داروں نے بڑے لوگوں کے کچھ عزیز و اقارب کو اچھی تنخواہوں والی ملازمتیں دے کر ان کی آواز بند کر دی اور شہر پر پڑنے والے برے اثرات پر پردے ڈال دیئے گئے اور فیکٹری چالو ہو گئی۔ اپنی ذراسی غفلت اور لاپروائی سے جب بھی کوئی ملازم بھٹی کی بھینٹ چڑھا ہے، فیکٹری کی جانب سے ان کے ورثا کو اتنا کچھ دیا گیا ہے کہ آدمی کے دل سے موت کا خوف جاتا رہا ہے۔

لیکن دسمبر کی وہ رات بڑی قیامت خیز تھی۔ سارا شہر خاموش تھا۔ رات ابھی جوان تھی۔۔ لوگ لحافوں میں دُبکے پڑے تھے اور نائٹ شفٹ میں کام ہو رہا تھا۔ فیکٹری کی تجربہ گاہ میں لوگ نہ جانے کون سا نسخہ آزما رہے تھے۔ سارے دروازے مقفل کر کے دربان گیٹ کے باہر اسٹول پر اونگھتے اونگھتے سو گیا تھا۔

ویران صحرا کا گونجتا ہوا سناٹا نہ جانے کیسے شہر میں گھس آیا کہ طبیعت میں بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ اچانک خارج ہونے والی زہریلی گیس، موت بن کر پورے شہر پر سائے کی طرح پھیل گئی۔ ملازموں کے لیے گیس کے اس اخراج کو روکنا دشوار ہو گیا، کوشش میں کئی جانیں چلی گئیں، تب خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ وقت ٹھہر گیا، فضا سوگوار تھی، ماحول بوجھل اور رقت آمیز تھا۔

زہریلی گیس موت کی طرح کمرے کے کھلے دریچوں سے داخل ہوئی، صحن اور گلیارے سے ہوتی ہوئی پڑوس کے گھروں میں چلی گئی اور دیواروں کے شگافوں سے گزرتی ہوئی سڑکوں پر آدمی کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

گھپ اندھیری رات، ٹھٹھری ہوئی سردیوں کا موسم، نیند سے بھری آنکھیں، چہرہ بدحواس، آناً فاناً سارے شہر میں بھگدڑ سی مچ گئی، دُور تک آسمان میں منڈلاتا ہوا زہریلا دھواں حلق کو چھیدتا جان بچانے کی خاطر لوگ گھر بار چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ کوئی کسی کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ سب کی نگاہیں اپنے وجود سے ٹکی تھیں۔ ہر بات غیر یقینی لگ رہی تھی۔ جو دیوار پھاند سکا، بھاگ نکلا۔ بھاگتے بھاگتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے، انگلیاں زخمی ہو گئیں، تلووں میں کانٹوں کی چبھن نے پاؤں کی سوزش بڑھا دی۔ خون رِسنے لگا، لیکن کسی کو اتنی فرصت کہاں کہ رُک کر پاؤں میں پڑے کانٹے کو چُنتا پھرے۔ اندھیرے میں کہاں کچھ دکھائی دیتا ہے۔ دوڑتے رہنا بس زندگی کی نشانی ہے۔ اگر ستانے یا دم لینے کا خیال آ گیا تو ہمیشہ کے لیے ناکارہ اور اپاہج بن کر رہ جائے گا یا ٹھوکر کھا کر موت کے سمندر میں اُتر جائے گا۔

ٹھوکر کھایا ہوا آدمی گر کر سنبھل جاتا ہے، بھلے ہی کہنیاں چھل جائیں، گھٹنے میں چوٹ آ جائے، لیکن گیس کا اثر آدمی کے بدن میں زہر پیدا کر دے گا۔ دُھوپ میں اس کا سارا جسم موم کی طرح پگھل جائے گا، پھر کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔

لوگ بھاگ رہے تھے۔ کاروں، بسوں اور ٹرکوں پر اپنے قیمتی سامان لاد کر پورے پریوار کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔ جو لوگ راہوں میں بچھڑ گئے، راستہ بھول گئے یا بھاگنے والوں کا ساتھ نہ دے سکے، وہ سڑکوں پر پڑے منہ سے جھاگ اُگلنے لگے، آنکھوں اور سینے کی تکلیف سے ان کا بُرا حال تھا، چہرے پر بہت سی خراشیں پڑ چکی تھیں۔ جو دُھند میں کھو گئے وہ سمندر میں غرق ہو گئے۔

دھنواں اور گہرا ہوتا گیا اور پھیلتا گیا۔ شہر شہر، گاؤں گاؤں، بستی بستی دھوئیں کی لپیٹ میں آتے گئے۔

پل بھر میں ساری دنیا کی نگاہیں اس سمت اُٹھ گئیں۔

صبح ہوئی تو سارا شہر خالی ہو چکا تھا، ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی تھیں، جیسے مٹی کے کھلونوں سے کھیلتا ہوا کوئی بچہ غصہ میں آ کر کوئی کھلونا اس طرح پھینک دے کہ کھلونا ٹوٹ کر سارے آنگن میں ریزہ ریزہ بکھر جائے۔

کئی گدھ آسمان کی وسعتوں میں منڈلا رہے تھے اور کہیں دُور کھیتوں کے کنارے پڑی لاشوں کے بیچ ایک گدھ بیٹھا ایک جوان عورت کی اَدھ کھلی آنکھوں کو نوچ نوچ کر کھا رہا تھا اور قریب ہی کوئی جنگلی جانور ایک بچے کی لاش کو منہ میں دبائے قبرستان کی طرف بھاگ رہا تھا۔

سڑکوں نے اپنے رُخ اچانک بدل دیئے تھے، کچھ سڑکیں قبرستانوں کی طرف مڑ گئی تھیں اور کچھ شمشان کی سرحدوں کو چھو کر گم ہو گئی تھیں۔ اس سے آگے کوئی راستہ نہیں تھا۔

زندگی گھروں سے نکل سڑکوں پر آ گئی تھی اور راہوں کی گرد میں صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھتی جا رہی تھی، قبرستان آباد ہونے لگے تھے، کئی بڑی قبریں وجود میں آئیں، جن میں دفن مردوں کی صحیح تعداد کا پتہ لگانا مشکل ہو گیا تھا۔

گیس کا اثر بڑا عجب ہوا تھا۔ نئی نئی بیماریاں اُبھر کر سامنے آنے لگیں، باہر سے ڈاکٹر منگوائے گئے۔ دواؤں کے ساتھ غیر ملکی ڈاکٹروں کی ٹیمیں آئیں، مفت دواؤں کی سہولتیں فراہم کی گئیں، لوگ سوچ میں پڑ گئے۔

شہر ایک عظیم سانحہ سے دو چار تھا۔ پھر انسانی لاشوں کی قیمت لگائی گئی۔ پہلے صوبائی

حکومت نے متاثرین کو مالی امداد کی پیشکش کی۔ پھر مرکزی حکومت نے مرنے والوں کے ورثا کو دس دس ہزار روپے دینے کا اعلان کیا۔

جو لاشیں کئی دنوں سے اپنے عزیزوں کے لیے ترس رہی تھیں، اچانک ان کے وارث پیدا ہو گئے۔ اندھیروں کا سایہ جو آدمی کے بائیں کاندھے پر مسلّط تھا۔ اسے بھی کچھ ایسا ہی احساس ہوا کہ ابلیس زندگی کے ہر گام پر آدمی کو بہکانے اور ورغلانے کا فعل جاری رکھے ہوئے ہے۔

ہوا یوں کہ حاجت مندوں کو امدادی فنڈ بانٹنے کے لیے جو عملے آئے تھے، انھوں نے برباد شدہ اور تباہ حال لوگوں کے ہاتھوں میں سو دو سو تھما کر ہزاروں کے کاغذات پر دستخط کرا لیے۔

اس افراتفری میں ایک نوجوان جو بہت دیر سے اسٹریٹ پول کے پاس کھڑا کچھ سوچ رہا تھا اچانک کہیں غائب ہو گیا اور جب وہ گلی کے نکّڑ پر وارد ہوا تو اس کے کاندھے پر ایک اجنبی عورت کی لاش تھی اور ایک مردہ بچہ بھی اس کی بغل میں دبا ہوا تھا اور امدادی کیمپ کے احاطے میں اس کے قدم تیزی سے اندراج کے دفتر کی جانب اُٹھ رہے تھے۔ وہ چور نگاہوں سے آس پاس کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ جب آدم کا پتلا بن کر تیار ہو گیا تو روح کو حکم ہوا کہ:

''اے روح قلب آدم میں داخل ہو جا!''

روح گھبرا کر نکل آئی اور بولی۔

''خداوندا! وہاں تو بہت اندھیرا ہے!''

تب اللہ نے آنے والے پیغمبر کی روشنی سے آدم کی پیشانی کو منور کیا اور روح داخل ہو گئی۔

ابلیس نے فریاد کی۔

''الٰہی جب تو مجھے دُنیا میں بھیج رہا ہے تو قیامت تک زندہ رہنے کا حق دے!''

اللہ نے اس کے گلے میں لعنت کا طوق ڈال کر کہا۔

''جا میں نے عطا کیا۔ لیکن یاد رکھ جو میرا ہے وہ میرا رہے گا۔ وہ تیرے بہکانے میں ہرگز نہ آئے گا!''

OO

فاصلے

میں ناگ راج کے دفتر کے سامنے کھڑا تھا نگاہیں اس کے نام کی تختی پر جمی تھیں اور ذہن میں اس کی یادوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔

میں نے دیکھا اب تک اس سے ملنے یہاں جو بھی آیا سب نے اپنے اپنے نام کی پرچیاں اس کے پاس بھجوائیں اور اندر سے بلاوا آنے پر سبھی ایک ایک کر کے اس سے مل کر لوٹ گئے۔ میں سوچنے لگا، کیا ناگ راج سے ملنے کے لیے مجھے بھی اپنے نام کی پرچی اس کے پاس بھجوانی ہوگی؟ اپنائیت کے بھی تو کچھ تقاضے ہیں۔ کارڈ دیکھ کر وہ بھی کیا سوچے گا؟

میں اندر جانے کی ہمّت بٹورنے لگا اور ابھی دروازے کی چق کو ہٹانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ مجھے ٹول پر بیٹھے چوکیدار کا خیال آ گیا۔ اگر اس نے ٹوک دیا تو؟ ہماری دوستی میں کہیں کوئی گرہ ضرور پڑ جائے گی۔

میں نے اسی لمحے جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا اور اس پر اپنا نام اور پتہ لکھ کر چپراسی کو دے دیا۔ چپراسی پرزہ رکھ کر واپس آیا تو میں نے پوچھا۔

"کیا صاحب نے میرا نام پڑھا؟"

"میں پرچی ٹیبل پر رکھ آیا ہوں۔ صاحب خالی ہوتے ہی بلا لیں گے!"

میں دروازے سے ہٹ آیا اور برآمدے میں ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا۔ وہ بھی کیا دن تھے۔ جب ناگ راج میرا بڑا بے تکلف دوست تھا۔ دونوں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور برسوں ہوسٹل کے ایک ہی کمرہ میں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ کالج کا ماحول بڑا پیارا اور دلچسپ تھا۔ ہوسٹل کی چھوٹی سی مگر بے حد خوبصورت دنیا، جس کی گود میں کھیلنے، مستقبل کے

رنگین سپنے سجانے اور حسین خواب بُننے کا شوق۔ فرصت کے اوقات میں کھیلنا اور گھومنے جانا کتنا اچھا لگتا تھا۔ چار برسوں کا ایک طویل عرصہ نہ جانے کیسے دن گنتے گزر گیا۔

شاندار ریزلٹ کے ساتھ جب ہم نے اپنی پڑھائی پوری کر لی تو اس یقین کے ساتھ ہوسٹل چھوڑا کہ زندگی بھر ایک دوسرے کو یاد رکھیں گے۔ وقت چاہے کتنا ہی کیوں نہ بدل جائے ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

مگر جب ساتھ چھوٹا اور روزی روٹی کے چکر میں ایک دوسرے کے راستے الگ ہو گئے تو ہمیں کچھ پتہ بھی نہ چلا کہ کون کہاں اور کس حال میں ہے؟

گھر کے سامنے ایک بہت بڑا پیڑ تھا، جس کی شاخوں پر پرندوں کے کئی گھونسلے پہلے کی طرح اب بھی ٹکے ہوئے تھے۔ درخت میں پھل بہت آتے تھے۔ آم کے دنوں میں ڈالیں پھلوں کے بوجھ سے جھک جاتی تھیں۔ آم بھی بڑے میٹھے اور لذیذ ہوتے تھے۔

لیکن جب حالات کے ساتھ گھر کی فضا بدلی اور مہنگائی نے اپنے اثر دکھانا شروع کیا تو درخت میں پھل بھی کم آنے لگے اور اس کی مٹھاس میں بھی کمی آگئی۔

گھر والوں کی میری ذات سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ والد کے ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن پر گزارہ مشکل ہو گیا تو مجھ سے گھر کی خستہ حالی دیکھی نہ گئی اور میں نے نوکری کی تلاش میں بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ مگر نوکری ملنا آسان نہ تھا۔ دفتروں کے چکر کاٹتے اور انٹرویو دیتے ایک زمانہ گزر گیا مگر نوکری نہیں ملی۔ میری پریشانیوں میں اضافہ ہونے لگا تو گھر والوں کو میری فکر ستانے لگی اور پھر ایک روز والدین کے بے حد اسرار پر میں سبیتا کو بیاہ کر لے آیا۔ سبیتا جہیز کے نام پر ضرورت کی تمام چیزوں کے ساتھ قیمتی زیورات اور نقد رقم بھی اپنے ساتھ لائی۔ مجھے بڑا سہارا ملا اور وہ مجھ میں گم ہو کر مجھے جینے کا حوصلہ دیتی رہی۔ لیکن جب وقت نے عمر کی حد پار کر لی اور مجھ پر نوکری کے دروازے نہیں کھلے تو میں نے گاؤں کے ایک اسکول میں ٹیچر بن جانا ہی مناسب سمجھا۔

ناگ راج کے بارے میں اتنا تو میں جانتا ہی تھا کہ کالج چھوڑتے ہی اسے ایک دفتر میں ٹرانسلیٹر کی جگہ مل گئی تھی۔ مگر شادی کے بعد بیوی کی سفارش پر جب اسے کسی مل میں مینجر

کا عہدہ مل گیا تو اس کے دن پھر گئے۔ اور وہ نوکری چھوڑ کر مل میں کام کرنے لگا۔ جہاں اسے اچھی تنخواہ کے ساتھ رہنے کے لیے بڑھیا کوارٹر کی سہولت بھی ملی ہوئی تھی۔

پورے دس سال بعد آج اس سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ امید تھی پرچی دیکھتے ہی وہ مجھے لینے دروازے تک ضرور آئے گا اور گلے لگا کر کہے گا، تم نے پرچی بھیج کر میرا منہ چڑایا ہے۔ تمھاری یہ حرکت مجھے اچھی نہیں لگی۔

مگر ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ انتظار کرتے کرتے جب میں پوری طرح تھک چکا تو مجھے اندر جانے کا بلاوا آیا۔ گھنٹی کی آواز پر چپراسی نے پردہ سرکا کر اندر جھانکا اور صاحب کا اشارہ پاتے ہی مجھے انگلیوں کے اشارے سے بلا کر اندر بھیج دیا۔

مجھے دیکھ کر ناگ راج کے چہرے پر ایک لمحہ کے لیے مسکراہٹ اُبھری۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے میرا استقبال کیا اور مجھے اپنے روبرو بٹھا کر چپراسی کو آواز دی اور اورینج جوس کے دو بوتل لانے کو کہہ دیا۔ جب چپراسی چلا گیا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

''اتنے دنوں تک کہاں رہے۔ بڑی مدت بعد دکھائی پڑے ہو؟''

''ہاں وقت نے تو مہلت نہیں دی مگر میں آج تک تمھیں بھولا نہیں ہوں!''

''شادی کر لی یا اب تک کنوارے ہو؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''کنوارا رہتا تو شاید تم سے ملنے کی نوبت نہیں آتی!'' میں نے اپنی افسردگی چھپانے کی بڑی کوشش کی مگر اس نے میرا چہرہ بڑھ لیا اور بولا۔

''کچھ پریشان سے دکھائی پڑ رہے ہو؟''

''ہاں کچھ سیتا کے آپریشن کا معاملہ ہے!''

''آپریشن، کیسا آپریشن؟''

''اس کے گردے خراب ہو چکے ہیں۔ خیر سے ایک گردے کا بندوبست تو ہو گیا ہے۔ ایک رحم دل عورت پچاس ہزار میں اپنا ایک گردہ دینے کو تیار ہوئی ہے!''

''ایسے کاموں میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ معلوم نہیں کب آدمی کا ارادہ بدل جائے!''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا کروں۔ ڈاکٹروں کی فیس اور دواؤں کے لیے پیسے کچھ کم

پڑ رہے ہیں!''

''کتنی رقم درکار ہوگی؟''

''یہی کوئی دس ہزار۔ اس میں بھی پانچ ہزار سیتا کے بھائی نے دینے کو کہا ہے۔ باقی تم دے دو تو کام چل جائے گا۔'' میرا گلا رُندھ گیا۔ آنسو کو مسکراہٹوں میں چھپانے کی کوشش کی مگر میری زخم خوردہ مسکراہٹ دیکھ کر اسے بھی جیسے کوئی غم چھو گیا۔ اس نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔ ''تم تو جانتے ہی ہو کہ مہینے کا آخری چل رہا ہے اور آخری دنوں میں نوکری پیشہ لوگوں کی جیبیں خالی ہوتی ہیں۔ پھر بھی میں کوئی انتظام کر سکا تو سیتا کی جان بچا کر مجھے بھی خوشی ہوگی۔''

اتنے میں چپراسی اورنج جوس کے دو بوتل میز پر رکھ گیا۔ ایک اس نے میری طرف سرکا دی اور دوسری اپنے ہونٹوں سے لگا کر پینے لگا۔ چند گھونٹ لے کر وہ کرسی سے اٹھا اور مجھ سے بولا۔ ''تم ٹھہرو۔ میں پیسے کا کوئی انتظام کرتا ہوں۔''

اس کے قدموں کی چاپ دروازے کے باہر جا کر گم ہوگئی۔ میں نے بوتل منہ سے لگا لی اور ماضی کے روشن دریچوں کو کھلتے ہوئے دیکھا۔

سیتا پچھلے چھ ماہ سے بیمار تھی۔ پہلے گاؤں میں اس کا علاج چلا۔ کئی ڈاکٹر بدلے، لیکن مرض میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ دن بدن بیمار بڑھتی ہی گئی۔ جب پرانے ڈاکٹروں کے تمام نسخے بے اثر ہو گئے تو میں اسے علاج کے لیے شہر لے آیا۔ کئی طرح کی جانچ کے بعد پتہ چلا کہ سیتا کے گردے خراب ہو چکے ہیں جن کا بدلنا بے حد ضروری ہے۔

اتفاق سے اسپتال کا ایک کمپاؤنڈر میری جان پہچان کا نکل آیا اور اس نے میری بڑی مدد کی۔ کافی دوڑ دُھوپ کے بعد وہ ایک عورت کو اس بات پر راضی کر سکا کہ پچاس ہزار لے کر وہ ایک گردہ سیتا کو دے دے۔ اس کا بھی کام چل جائے گا اور سیتا کی زندگی بھی بچ جائے گی۔ پھر بھی پانچ ہزار کم پڑ رہے تھے۔ اگر ناگ راج نے دے دیا تو ساری مشکل آسان ہو جائے گی۔

مگر ناگ راج روپے کا کوئی انتظام نہیں کر سکا۔ منہ لٹکائے ہوئے میرے پاس آیا اور

اُداس لہجے میں بولا۔

''تم میرے ساتھ گھر چلو۔ میں بیگم سے کہتا ہوں۔ اگر پیسے ان کے پاس ہوئے تو میں تمھیں دلوادوں گا۔ مگر کچھ دیر رکو، ذرا اس فائل سے نمٹ لوں پھر ساتھ چلیں گے!''

وہ فائل دیکھتا رہا اور میں اس کے سامنے بیٹھا ٹوٹتی ہوئی اُمیدوں کو سہارا دینے کے لیے خالی خالی نظروں سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ضرورت ہی کچھ ایسی تھی کہ انکار ممکن نہ تھا۔

اسے فائل سے نمٹنے میں کافی دیر ہوگئی۔ کام سے فراغت پا کر اس نے کرسی کھسکائی اور اٹھتے ہوئے بولا۔

''بور تو نہیں ہو رہے ہوں؟''

''بوریت کیسی۔ تمھارے ساتھ تو میں پورے چار سال گزار چکا ہوں!''

دونوں باتیں کرتے ہوئے باہر نکلے۔ گیٹ پر ڈرائیور کار لیے کھڑا تھا۔ ہم پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ سفید ماروتی کار سڑک پر دوڑنے لگی۔ میں نامعلوم سوچوں میں غرق ونڈ اسکرین کے باہر پھیلے اندھیروں کو تکتا رہا۔

کچھ ہی دیر میں گاڑی اس کے بنگلہ کے سامنے پورٹیکو میں جا کر رُک گئی اور دونوں اس کے خوبصورت سے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر آمنے سامنے پڑے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ چھوٹا سا اس کا ڈرائنگ روم جدید آرٹ کے نمونوں سے مزین تھا۔ دروازے اور کھڑکیوں پر خس کے پردے لٹک رہے تھے، جس کی بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو تازگی کا احساس دلانے لگی۔

چند لمحے بعد وہ مجھے یوں ہی بیٹھا چھوڑ کر اندر چلا گیا اور جب کپڑے تبدیل کر کے لوٹا تو اس کے پیچھے گھر کا ملازم بھنے ہوئے کاجو کے ساتھ کافی کی ٹرے لیے کھڑا تھا۔ ایک پیالی اس نے مجھے تھما دی اور دوسری لے کر اپنے آگے کر لیا۔ ابھی ہم نے کاجو کے چند دانے ہی منہ میں ڈالے تھے کہ ایک ٹیکسی دروازے سے آ کر لگی اور ایک بے حد خوبصورت سی عورت کپڑوں کے کئی تھیلے لیے گاڑی سے اُتری اور ڈرائنگ روم کا اَدھ کھلا دروازہ دیکھ کر سیدھے اندر چلی آئی اور ناگ راج پر نظر پڑتے ہی بولی۔

''میں جانتی تھی۔ تم آج بھی لیٹ آؤ گے۔ اسی لیے مجھے اکیلے ہی شاپنگ کو جانا پڑا۔ دیکھو، برکھا کی شادی کا تحفہ لائی ہوں۔ خالص سونے کا ہے۔ پورے نو ہزار لگے ہیں۔ کچھ کپڑے رہ گئے تھے وہ بھی گردھاری لال کی دُکان سے اُدھار لے آئی ہوں۔ وہ تو پچھلے پیسے کے لیے بھی کہہ رہا تھا۔ بول آئی ہوں کہ اس بار صاحب کو تنخواہ ملتے ہیں تمھارے سارے پیسے بھجوادوں گی!''

اس نے ہار کا سنہرا بکس ناگ راج کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور کپڑے وہیں صوفے پر چھوڑ کر اندر چلی گئی۔ میری طرف دیکھا تک نہیں۔ شاید اسے میری موجودگی کا کوئی احساس نہیں تھا۔ یا وہ مجھے نظر انداز کرنا چاہتی تھی۔

ناگ راج نے بڑی بے چارگی سے میری طرف دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے پر شام کا اُداس ملگجا اندھیرا پھیلا تھا۔ اس کی افسردگی جیسے مجھ سے کہہ رہی تھی۔

''یار اس وقت بیگم کا پارہ کچھ گرم ہے۔ تم کل آؤ۔ جیسے بھی ہو، میں تمھارے لیے پیسے کا انتظام کردوں گا!''

میرے دل میں آیا کہ اس سے کہہ دوں۔ رہنے دو، مجھے نہیں چاہیے تمھارے پیسے۔ مگر منہ سے کوئی بات نکل نہ سکی۔ صرف بدبدا کر رہ گیا۔

''بہت اچھا!'' اور اس سے پہلے کہ ناگ راج کچھ بولے، میں نے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے اور کرسی چھوڑ کر باہر آ گیا۔

اسپتال کی جانب لوٹتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ سیتا ایمرجنسی وارڈ کے ایک بیڈ پر پڑی کس بے صبری سے اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ شاید اسے اس بات کا یقین آ جائے کہ ناگ راج میرا بے حد اپنا اور گہرا دوست ہے۔ اس کی بیماری کا حال سن کر اس کی مدد کو آمادہ ہونے میں اسے دیر نہیں لگی۔

شام کا اندھیرا سورج کی آخری کرنوں کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا۔ اسپتال روڈ پر زندگی رواں دواں تھی۔ فٹ پاتھ پر چلنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ سڑک کی دونوں جانب ایستادہ پیڑوں کی نرم ہوا جسم کو چھوتی گزر رہی تھی۔ میں نے اپنی چال اور تیز کردی۔

ایک لمحہ کے لیے مجھے خیال آیا۔ میری جھوٹی تسلیاں سیتا کو تو مطمئن کر دیں گی۔ جینے کی آرزوؤں کو بل ملے گا۔ اس کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئے گی، مگر میں اپنے آپ کو کیسے سمجھاؤں؟

وہ ناگ راج جو میرا دوست تھا، پہلے جیسا نہیں رہا۔ بہت بدل گیا ہے۔ لگتا ہے بارونق بازار کی کسی انجان گلی میں کہیں کھو گیا ہے یا زندگی کے کسی خوبصورت موڑ پر اس کی اَنا اسے دغا دے گئی ہے! ہمارے درمیان اب فاصلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ دوریاں پاٹنی مشکل ہیں۔

اب وہ ناگ راج مجھے نہیں مل پائے گا شاید کبھی نہیں۔ مگر سیتا؟
کیا اس کے ساتھ بھی میرے فاصلے بڑھ جائیں گے؟

○○

لامحدود سمتوں کا سفر

میں تو ازل سے محوِ سفر ہوں۔
جب اپنے ہی شہر میں مجھے اپنا وجود اجنبی سا لگنے لگا تو ماضی سے حال تک پھیلی ہوتی افراتفری اور انتشار سے گھبرا کر میں اس سکون کی کھوج میں گھر سے نکل پڑا۔ جو میری روح کی بے چینی اور اضطراب کا مداوا بن سکے۔ سوا نیزے پر اُترے سورج والے اس شہر میں جہاں آدمی کی انگلیاں جلنے لگیں کوئی کیسے جئے؟
شہر کے ہنگاموں اور گھنی آبادی کے شور سے دور برسوں کی طویل مسافت طے کر کے۔ میں اس شہر میں داخل ہوا ہوں۔ جس کے افق پر مسکراتا ہوا چاند ساری کائنات پر ٹھنڈی شعائیں بکھیر رہا ہے۔ ہر طرف خیرات بٹ رہی ہے۔ کچھ اجنبی چہرے اپنی جھولیاں پھیلائے ان کی چوکھٹوں پر سرنگوں ہیں اور ان پر اپنی بہاریں لٹا کر ان کی تنہائیاں دُور کر رہے ہیں اور بدلے میں اپنی جھولیاں بھر رہے ہیں۔ فضاؤں میں موسیقی کی لہریں اُبال کھا رہی ہیں۔ شاید یہی میری منزل ہے۔ جس کی مجھے تلاش تھی۔ جہاں سے صدیوں پرانا میرا روایتی رشتہ قائم ہے۔ جس کی کھوج میں صدیوں سے صحرا صحرا بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ صحرا کے ذروں میں جب کرنوں کا عکس پھوٹتا ہے تو اس میں سونے کی سی چمک آ جاتی ہے۔ آدمی کا احساس بھی کتنا عجب ہوتا ہے۔ میں نے ان ذروں سے پھوٹتی ہوئی کرنوں کو اپنے وجود میں اُتارنے کی کوشش کی۔ لیکن میری یہ خواہش بے معنی سی ہو کر رہ گئی۔ دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی۔ لیکن اب بھی وہ اپنے آپ میں کھوئے ہوئے ہیں اور پرکھوں سے چلی آ رہی دشمنی کا بدلہ چکانے میں مصروف ہیں۔ ذلت اور رسوائیاں ان کا مقدر بنتی جا رہی ہیں۔ ان کی بے حسی اور بے

حیائی میرے دل میں ایک کسک سی چھوڑ گئی۔ان کا اپنے دائرے میں سمٹنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ ریت کے ان ذروں کو جب مٹھی میں بھر کر دیکھا تو صحرا کی ساری صفتیں اس میں موجود تھیں۔نرم چمکیلی ریت پر لیٹ کر دریا کی پُرشور لہروں کا تماشہ دیکھنا۔یا ہوا کے دوش پر بادلوں کے ٹکڑوں کا ان دیکھا سفر۔کبھی کبھی کتنا اچھا لگتا ہے۔لیکن جو باتیں میرے اصول کے خلاف ہوں۔میرے مزاج کے مطابق نہ ہوں۔ وہ نظارے اپنے ہوتے ہوئے بھی اپنے نہیں ہوتے۔میرا اپنا آپ بھی ان کے ماضی کی طرح دُھندلکوں میں محبوس ہوتا جارہا ہے۔شطرنج کی ہاری ہوئی بازی کی طرح۔وقت کا خالی کشکول لیے میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔

صحرا سے جب کوئی کارواں گزرتا ہے تو اس کے سینے پر کتنے قدموں کے نشانات اُبھر آتے ہیں،لیکن جب آندھی چلتی ہے تو ان نشانوں کو مٹاتی ہوئی گزر جاتی ہے اور بعد میں جب ادھر سے کسی کا گزر ہوتا ہے تو صحرا کا سپاٹ سینہ اسے بالکل کورا نظر آتا ہے۔

مٹھی بھر ذرّات میں نے اپنی کشکول میں رکھ لیے ہیں تا کہ لوگ مجھے بزدل نہ سمجھیں۔ یہ ذرّات شاہد ہیں کہ میں نے منزل کی تلاش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔کہاں کہاں نہیں گیا۔ لق ودق دشت وصحرا خطرناک اور مہیب جنگلی،دشوار گزار سلسلہ کوہ اور پرشور دریاؤں سے بھی بہت آگے۔کہاں نہیں گیا میں!

میں تو جس جس مقام پر رُکا مجھے منزل کا گمان ہوا۔لیکن روشنی کے اُجالوں میں کوئی بھی میرے معیار پر پورا نہیں اُترا۔سایوں کے پیچھے دوڑتے رہنا تو زندگی نہیں ہے۔صرف وقت کاٹنے اور اپنے گردوپیش کو بھول جانے کا ایک بہانہ ہے۔جس کا کچھ حاصل نہیں۔

ایک موڑ پر تو مجھے کچھ ایسے لوگ بھی ملے جن کے قد ناٹے تھے،لیکن بدن کسرتی تھا۔ بڑے محنتی،جفاکش اور منکسر المزاج تھے۔ان کی رواداری اور انفرادیت ان کی پہچان تھی۔ لوگوں کے چہروں پر شادمانی کی جھلکیاں تھیں۔صحت مند جسموں کو اناج کی آسودگی حاصل تھی۔لیکن سبھی زندگی سے بیزار اور اپنے وجود سے بے نیاز دکھائی دیتے تھے۔اس جگہ جو بات مجھے سب سے الگ لگی۔وہ یہ تھی کہ یہاں ہر شخص غلام تھا،ہر شخص خودمختار تھا۔بڑی بڑی کمپنیوں میں اس کے مالکانہ حقوق تھے۔وہ لوگ جس جگہ رہتے تھے۔وہ زمین ان کی تھی۔وہ

کھیت ان کے اپنے تھے۔ سب کچھ ان کا اپنا تھا اور ان سبھوں میں ایک بات مشترک تھی۔ وہ یہ تھی کہ انھیں ضرورت کی ساری چیزیں راشن کی دُکانوں سے لمبی لائن لگائے بنا ہی آسانی سے مل جاتی تھیں۔ ان کے کارڈوں پر ان کے نام پتے۔ ان کی قابلیتیں اور ضرورت کی سبھی چیزوں کے نام درج ہیں جو انھیں دن بھر کی مزدوری کے عوض مل جاتی ہیں۔ جانے کیوں ایک ہی سوال میرے ذہن میں بار بار گونج رہا ہے۔ کتنے سالوں سے وہ لوگ ایک دوسرے کے دُکھوں کو اپنے اندر چھپائے ہوئے مسکرا رہے ہیں۔ دنیا کی خوشی کی خاطر اپنے روحانی کرب کو بناوٹی مسکراہٹوں میں بدلنے کی کوششوں میں مگن ہیں۔ سیاسی شعور کی بیداری کے باوجود اپنے آپ کو اس حصار سے نکال نہیں سکتے کہ بنیادی اخلاقی حدوں کو روندنا ان کے بس میں نہیں۔ اس جبر کا احساس سبھی کو ہے۔ ان کی آنکھوں میں بے یقینی کا جو احساس چھپا ہے۔ وہ انھیں کسی پل کسی لمحہ سکون لینے نہیں دیتا۔ ان کا رنگ بہت صاف تھا۔ لیکن دل کے بڑے میلے نکلے۔ وہ لوگ پہلے تو میری بڑی آؤ بھگت کی۔ مہمانوں کی طرح رکھا۔ بھائیوں کی طرح پیش آئے۔

لیکن ایک روز جب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ لوگ میری ڈائری کے کچھ اوراق اُڑانا چاہتے ہیں، جنھیں میں سارے زمانے کے کرب اور پورے وجود کے انتشار سے گزر کر تکمیل کے آخری مرحلے تک لایا تھا۔ تو میں انھیں چھوڑ کر بھاگ آیا۔ پھر کچھ دنوں تک اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ منزل کو پانے کی خواہش تھی۔ اسی لیے شوق میں آگے بڑھتا رہا۔ سفر کی صعوبتوں کا احساس تک نہ ہوا۔ راہ میں بہت ساری دشواریاں پیش آئیں۔ حالات کچھ سے کچھ ہو گئے۔ لیکن میں نے حوصلہ بنائے رکھا۔ سخت بہت سخت اندھیروں کا سامنا بھی ہوا۔ درندے بھی میری راہ میں آئے۔ لیکن آدمی کا ارادہ اٹل ہو اور لگن سچی ہو تو منزل خود چل کر سامنے آ جاتی ہے۔

اور اس جگہ جہاں میں کچھ دیر کے لیے رُکا ہوں شاید کوئی جزیرہ ہے۔ بالکل چھوٹا سا۔ لیکن بے انتہا خوبصورت۔ دل تو پہلے ہی ڈرا ہوا تھا۔ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر حالات کا جائزہ لینے لگا۔

آبادی بڑی گھنی تھی۔ لوگ پڑھے لکھے اور مہذب تھے۔ دولت کی افراط تھی۔ گوداموں میں اناج کے ڈھیر تھے۔ جگہ جگہ جدید قسم کے سائنسی آلات نصب تھے۔ یہاں کل اور کارخانوں میں آدمی کے پتلے تیار ہوتے تھے اور ان میں روح پھونک کر دور دراز کے علاقوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ ایسے تمام لوگوں کے ناموں کی فہرست ریکارڈ روم میں موجود تھی اور جب جہاں جس آدمی سے جو کام بھی لینا ہوتا تھا دفتروں میں بیٹھ کر بٹن دباتے ہی سارا کام پلک جھپکتے ہو جاتا تھا۔ اپنے آقاؤں کے اشارے پر ناچنے والے یہ لوگ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھے۔

کہیں خلفشار مچانا ہو یا صلح و آتشی کا پیغام پہنچانا ہو۔ یہ منٹوں میں چاند کی سیر کر آتے تھے اور سورج پر کمندیں پھینکنے میں بڑی چالبازی سے کام لے رہے تھے۔ مجھے ان کی یہ اخلاقی گراوٹ پسند نہیں آئی۔ للچائی ہوئی نگاہوں میں حقارت کا طوفان تھا اور میں اس طوفان کی زد میں آنے کا خواہشمند نہیں تھا۔

جوڑ توڑ اور سازشوں کے جال میں اُلجھنے سے پہلے میں وہاں سے نکل آیا اور اپنے کندھوں پر اجنبیت کا بوجھ اٹھائے پھرتا رہا۔ میرے حوصلے میرے ارادوں کی شناخت بن چکے تھے، جس نے میری انا کو ٹوٹنے سے ہر لمحہ بچائے رکھا۔ اگر غفلت کی دھند میں بہک جاتا تو وقت دیمک کی طرح میرے وجود کو چاٹ جاتا۔

تھکن سے چور نڈھال ہو کر، میں ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گیا، حد نگاہ تک پھیلی ہوئی چاندنی اپنے حسن کا جادو جگا رہی تھی۔ کھیتوں میں گیہوں کی بنالیاں سونا بکھیر رہی تھیں، فضا میں سرسوں کے پھولوں کی مہک رچی بسی ہوئی تھی۔ مجھے لگا جیسے میرے سفر کا مقصد پورا ہو گیا ہو۔ مجھے میری منزل کا سراغ مل گیا ہو۔ میں بہت خوش تھا۔ ماحول کتنا خوبصورت تھا، دلفریب اور رنگین اور پشت پہلو تابندہ تراشے ہوئے کسی قیمتی پتھر کی طرح۔ میں اندر جانے کے لیے راہ ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ ایک بڑے سے آہنی پھاٹک پر جا ٹکی جس کی دونوں جانب رائفلوں سے لیس کئی فوجی جوان پہرہ دے رہے تھے۔

میں اجنبی ان کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر کسی طرح اندر جانے میں کامیاب

ہو گیا۔ اندر پہنچا تو میں حیران رہ گیا، جو چیز باہر سے اچھی لگے وہ اندر سے اتنی کریہہ صورت بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ بستی کے چاروں طرف انسانی ڈھانچوں اور سڑی گلی ہڈیوں کے کئی چھوٹے بڑے پہاڑ تھے، جو پانی کے دنوں میں بھیگ کر بدبودار ہو رہے تھے۔ لیکن دُھوپ کی تمازت میں جن کی مہک سے تہذیبی انقلاب کا پرچم لہراتا۔ ان میں سے زیادہ تر ہڈیاں سڑ گل گئی ہیں، لیکن کچھ انسانی ڈھانچے اب بھی صحیح و سالم ہیں اور ان لاشوں کی زبانیں باہر لٹک رہی ہیں۔ جن سے قطرہ قطرہ زہر ٹپک رہا ہے اور اس زہر کی بدبو نے پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اب انھیں اس بات کا احساس ہو چکا ہے کہ وہ کسی کے تابع ہیں۔ ان کی آزادی صلب کر لی گئی ہیں۔ جذباتی اور فطری رشتوں سے الگ ہو کر زندگی ہر لمحہ بکھرتی جا رہی ہے۔ اب انھیں کسی مسیحا کا انتظار ہے۔

میں نے سوچا۔ شاید یہاں مردوں کو جلانے یا دفنانے کا کوئی رواج نہیں ہوگا۔ اسی لیے لاشوں کے ڈھیر لگتے جا رہے ہیں۔

دوسرے لمحے قائد نے میرے چہرے پر اُبھرتے ڈوبتے تاثر کو بھانپ لیا اور کہا۔ تم ہر بات غلط ڈھنگ سے سوچنے کے عادی ہو۔ میرے ساتھ آؤ میں تمھیں ان مردہ لاشوں کی زندہ کہانیاں سناؤں۔

قائد مجھے لیے ہوئے ایک تاریک گپھا میں چلا آیا اور طاق سے ایک موٹی سی کتاب نکال کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر موم بتی کی مدھم روشنی میں وہ مجھے کتاب پڑھ کر سنانے لگا۔

کتاب کی جلد بہت مضبوط اور خوبصورت تھی۔ کاغذ قیمتی اور بے حد سفید تھے اور موم بتی کی ہلکی روشنی میں بھی سفید کاغذ میں کالے حروف چمک رہے تھے۔ میں ہمہ تن گوش بیٹھا۔ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ پڑھ رہا تھا۔

یہ لاشیں جو شہر کے چاروں طرف تم بکھری ہوئی حالت میں دیکھ رہے ہو۔ مظلوموں کی نہیں ہیں اور نہ ان میں کوئی بھوک سے مرا ہے۔ یہ اندھیرے کے پجاریوں اور گزرے موسموں کی یادگاروں کی لاشیں ہیں جنھوں نے اپنے قائد کی بات ماننے سے انکار کر دیا کہ قائد کا اصول ان کی نگاہوں میں فطری اصول کے خلاف تھا۔ ایسے لوگ نظریاتی اختلاف کی

چکی میں پس کر فنا کے گھاٹ اُتر گئے کہ زمانہ جب کروٹ بدلتا ہے اور تہذیبیں جب نئے لباس پہنتی ہیں تو ایسے لوگوں کو مکمل سکون موت ہی کی آغوش میں ملتا ہے کہ موت سارے دکھوں کا مداوا ہے۔ سب سے اہم مسیحا۔ لیکن اب یہاں موت پرانے راستوں پر چل کر نہیں آتی کہ اب یہاں کا اصول دنیا کی نگاہوں میں مقدم مانا جاتا ہے۔

گپھا سے نکل کر جب میں باہر آیا تو میرے ماتھے پر پسینہ تھا۔ میری جستجو بڑھ گئی۔ سامنے کئی دروازے آئے۔ میں بہت دیر تک دروازے میں کھڑا اندر کا تماشہ دیکھتا رہا اور یادوں کے دہکتے آتش دان میں خود کو جلاتا رہا۔ مجھے ایسے بہت سے بھولے بسرے چہرے یاد آئے جنھیں میں نے اپنے سفر کے دوران دیکھا تھا اور جو اتنی طویل مسافرت کے بعد بھی اب تک ذہن میں جوں کے توں محفوظ تھے۔ اس کے آگے دُھند تھی اور ذہن میں آندھیوں کا ریلا تھا۔ اندر کے لوگ اپنے اطراف میں پھیلے ہوئے لوگوں سے کس قدر ملتے جلتے تھے۔ ان کے چہروں کی تازگی کھوئی ہوئی تھی۔ آنکھوں کی چمک کہر کے دُھندلکوں میں ڈوبی ہوئی تھی اور ان کے ہونٹوں پر خوشی کی صلیب آویزاں تھی۔

اب میں اس جگہ مزید رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ سوچے اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔ دریا کے قریب پہنچ کر۔ اس کی پُرشور لہروں کا تماشہ دیکھنے کی خواہش جاگ پڑتی ہے۔ میں نرم گیلی ریت پر بیٹھ کر تھکن دُور کرتا ہوں۔ میری نگاہیں حدنظر تک پھیلے ہوئے آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔ جو دریا کے اس کنارے پر زمین سے ملا ہوا تھا۔ آسمان کا کنارا نیلا اور گلابی تھا۔

اچانک میری نگاہوں کے گھیرے میں وہ بستی آ گئی۔ جو بیچ دریا کی سطح پر تیر رہی تھی۔ اتنا خوبصورت ماحول اور اتنی دلکش بستی۔ میرے دل میں اس کو دیکھنے کی خواہش اُبھری۔ میں اس کی طرف لپکا۔ جیسے میرے خوابوں کی تعبیر میرے سامنے تھی۔ دُور سے بستی جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ اجنبیت کا کوئی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن جب نزدیک پہنچا تو حیرت سے میرا چہرہ فق ہو گیا۔ یہ تو میری اپنی بستی تھی۔ جہاں سے میں چلا تھا۔ اپنی منزل کی تلاش میں۔ باہر حالات پُرسکون تھے۔ لیکن اندر تو وہی پرانا ہنگامہ برپا تھا اور حالات کو وقت کے

فیصلے کا انتظار تھا۔ جو اُن کی زندگی سے زمانے کی تلخیوں کا بار اُتار دے گا اور لمحے صدیوں کی راہ پر اڑے جا رہے تھے۔ میں چند قدم چل کر پھر رُک گیا ہوں۔ ہر چہار سمت لٹیرے راہوں میں کھڑے ہیں۔ دُور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ شاید کوئی جنگلی ہاتھی شہر میں گھس آیا ہے۔ کوئی خونخوار بھیڑیا آج پھر کسی ذی روح کو لے بھاگے گا۔ آسمان پر یہ کیسا سناٹا چھایا ہے۔ شاید کوئی طوفان آنے والا ہے۔ سارا منظر گرد و غبار کے کہرے میں لپٹا ہوا ہے۔ رات کا جادو ٹوٹنے لگا ہے۔ میں ابھی مرا نہیں ہوں کہ اپنی ناکامی پر کہیں کسی گوشے میں تنہا بیٹھ کر آنسو بہاتا رہوں۔ کبھی مسکرا کر بھی زخموں کو دبانا پڑتا ہے۔ میں بے معنی سی کوشش میں مصروف ہوں۔ لوگ میری شکست کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ میں اپنا سفر جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید انتشار سے اپنے آپ کو بچا سکوں۔ میرا دل اب اتنے زوروں سے دھڑکنے کیوں لگا ہے۔ ساری کائنات تاریکی کے غار میں دھنستی جا رہی ہے۔

پھر اچانک ایک طوفان آیا اور سب کچھ دُھندلا گیا۔

میری ڈائری کے خالی اوراق کم ہوتے جا رہے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں۔ اگر اسی طرح ڈائری کے اوراق بھرتے رہے تو میری منزل کا کیا ہوگا۔ میں نے ابھی کوئی سبیل نہیں ڈھونڈی تھی کہ طوفان گزر گیا۔ میں نے اپنی دُھندلی آنکھوں کو مسل کر چاروں طرف دیکھا۔ آسمان صاف تھا۔ بادل چھٹ چکے تھے اور موسم اچانک بدلا ہوا تھا۔

ایک بار پھر میں لامحدود سمتوں کے درمیان آ کھڑا ہوا ہوں۔ یہی ابتدا تھی۔ یہی انتہا ہے۔ سفر مسلسل سفر، لامحدود سمتوں کا سفر!!

OO

ہنستے پھول

وہ اس خط کو اتنی بار پڑھ چکی تھی کہ اس کا ہر لفظ اس کے ذہن پر نقش ہو چکا تھا۔

اس نے ایک بار پھر خط کھول کر دیکھا اور اسے چوم کر پرس میں ڈال لیا۔ اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھا تھا، ہونٹوں پر خوشیاں مچلنے لگی تھیں اور وقت گزارے نہیں گزر رہا تھا۔ دیر تک وہ یونہی کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی۔ پھر آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور پورٹیکو سے کار نکال کر ارمان کو لینے چل پڑی۔

وہ جلد سے جلد اسے اپنی خوشیوں میں شامل کرنا چاہتی تھی۔ آج اس کے پاپا نے اس کی ضد کے سامنے اپنی انا قربان کر دی تھی۔ انھوں نے ایک سفارشی خط اس کے حوالے کر کے ارمان اور اس کے درمیان کی کھائی کو پاٹ دیا تھا۔ اب یہی خط اس کی اُمیدوں کا مرکز اور ارمان کو پانے کا وسیلہ تھا۔

وہ ایک بڑے باپ کی اِکلوتی بیٹی تھی۔ گھر بھر کی چہیتی اور دلاری۔ اس کے والد عباس میاں کو قدرت نے خاندانی شرافت کے ساتھ زندگی کا ہر سکھ دیا تھا۔ پورے علاقے میں ان کی شہرت تھی۔ زمینداری چھن جانے کے بعد بھی ان کے پاس اتنا کچھ تھا کہ پرانی ساکھ جوں کی توں بنی ہوئی تھی۔

زمینداری ختم ہونے کے بعد انھوں نے بڑی حکمتِ عملی سے اتنی دولت پیدا کر لی تھی کہ انھیں کوٹھی کے کسی ملازم سے ڈیوڑھی چھوڑنے کے لیے نہیں کہنا پڑا۔

حویلی کے احاطے میں پیچھے کی جانب جہاں پھوس اور مٹی کے چند کمرے بنے ہوئے تھے اور ان میں ڈیوڑھی کی نوکرانیاں اور دیگر کئی ملازمین رہا کرتے تھے۔ وہ حصہ بال بچوں

سے بھرا پڑا اور بڑا سہانا لگتا تھا۔ ہر طرف زندگی مسکراتی نظر آتی تھی۔ ان کے ہی دم سے ہنگامے آباد تھے اور کوٹھی کی رونق برقرار تھی۔

ارمان ڈیوڑھی کے ہی ایک پرانے خادم کا بیٹا تھا۔ نہایت خوبصورت ذہین اور بھولا بھالا۔ دل موہ لینے والی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ہر وقت کھلتی رہتی اس کی آنکھوں میں بلا کا جادو تھا۔ آرزو اس کی ہمجولی تھی۔ دونوں ایک ساتھ کھیلا کرتے۔ کبھی آنگن میں بیٹھے گھروندے بناتے تو کبھی گڈے گڑیا کا بیاہ رچاتے۔

غرض ہنستے کھیلتے لڑکپن بیت گیا۔ جوانی کی بہاریں قدم چومنے لگیں تو فضا گنگنا اُٹھی۔ ایسا لگنے لگا کہ پہلے ایک دوسرے کی قربت پا کر انھیں جو انجانا سکھ ملتا تھا اس کا ایک ایک لمحہ ان کی راہوں میں خوشیوں کے پھول کھلاتا رہا۔ اُمنگوں نے راہ کے سارے کانٹے چن لیے اور اپنائیت گہری ہو کر پیار کے رنگوں میں بدل گئی۔

دونوں نے اسکول کا امتحان پاس کر کے ایک ہی کالج میں داخلہ لیا۔ یوں تو کالج گھر سے بہت دُور تھا۔ لیکن یہ دوری بھی ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکی۔

کافی عرصے سے ایک کار کوٹھی کے گیراج میں پڑی تھی۔ اسی پر نیا رنگ وروغن کروا کے آرزو نے اسے اپنے استعمال میں لے لیا تھا۔

ادھر ارمان کی قسمت نے بھی اس کا ساتھ دیا اور کھیلوں میں نمایاں حیثیت کی بنا پر اسے کالج میں داخلے کے ساتھ ہوسٹل میں رہنے کی جگہ بھی آسانی سے مل گئی۔

پڑھائی میں جہاں وہ ہمیشہ اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کرتا۔ وہیں کھیلوں میں بھی آگے آگے رہتا۔

لیکن کالج اور ہوسٹل کی کھلی فضا میں بھی دونوں اسی طرح ملتے رہے جیسے گھر کی چہار دیواری میں ملا کرتے تھے۔

عباس میاں کو ان کی دوستی کا علم تھا۔ مگر وہ اسے آرزو کا بچپن اور ارمان کی خوش مزاجی سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے۔ انھوں نے ان کے میل ملاپ کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ سوچتے کہ جب بڑے ہو کر انھیں عقل آئے گی تو خود ہی اپنی حیثیتوں کو پہچان لیں گے۔

ارمان کو اپنی اوقات معلوم تھی۔ اسے اپنی کم مائیگی کا شدید احساس تھا۔ سوچ کے ٹیلوں پر کھڑا وہ زندگی کی رنگینی کو تلاش کرتے کرتے اکثر اُداس ہو جاتا۔ آرزو کو پانے کی خواہش کہیں اس کی انگلیاں جلا نہ دے۔ اگر آرزو کھو گئی یا اس نے اپنا راستہ بدل دیا تو کسی دیئے کی کانپتی لو کی طرح اس کا وجود بھی برقرار نہیں رہ پائے گا۔

بی اے کے بعد ارمان اپنی پڑھائی جاری نہ رکھ سکا۔ اس کے بوڑھے باپ میں ارمان کی تعلیم کا مزید بوجھ اٹھانے کی سکت نہ تھی۔ گھر کی ساری امیدیں اس کی اکیلی ذات سے وابستہ ہو گئی تھیں اور وہ کسی مناسب ملازمت کی تلاش میں جٹ گیا۔

آرزو مزید پڑھنا چاہتی تھی۔ مگر عباس میاں زیادہ پڑھائی کے حق میں نہ تھے۔ بیٹی کی پڑھائی کے سبب وہ پہلے ہی کئی رشتے ٹال چکے تھے۔ مگر بی۔اے کرتے ہی آرزو کے لیے ایک اچھا سا رشتہ آ گیا تو انھوں نے بیٹی کا بیاہ کر دینا ہی مناسب سمجھا۔

لڑکا پڑھا لکھا اور خاندانی تھا۔ کئی سال کویت میں انجینئر رہ کر پھر کبھی نہ جانے کے ارادے سے گھر لوٹ آیا تھا۔ دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔ عباس میاں دیر تک اپنی خوشی چھپائے نہ رکھ سکے اور ایک دن آرزو پر انھوں نے اپنی پسند کا اظہار کر ہی دیا۔ پہلے تو آرزو چپ رہی۔ پھر پڑھائی حرج ہونے کے بہانے گڑھنے لگی۔

عباس میاں کو نوید بے حد پسند تھا۔ وہ اس رشتے کو کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ بیٹی کے چہرے کو نظروں ہی نظروں میں ٹٹول کر بولے۔

''اتنا اچھا رشتہ مشکل سے ہی ملتا ہے!''

''لیکن پاپا!'' دل کی بات آرزو کے منہ پر آ کر رہ گئی۔ اس میں سوچنے کی کوئی بات نہیں آرزو۔ میں نوید کو جانتا ہوں۔ وہ خوبصورت بھی ہے اور خوش اخلاق بھی!'' عباس میاں نے بیٹی کو سمجھایا۔

''پاپا ارمان آپ کو کیسا لگتا ہے؟''

ارمان کا نام سنتے ہی عباس میاں کے ہونٹ سکڑ گئے۔ بھویں تن گئیں۔ اور آنکھیں انگاروں کی طرح دہک اٹھیں۔ وہ تلخ لہجے میں بولے۔

''یہ تو بہت مشکل ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا!''

''ارمان میں کوئی برائی نہیں پاپا۔ وہ پڑھا لکھا ہے۔ اگر نوکری مل گئی تو بڑا آدمی بھی بن جائے گا!'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''یعنی میں ایک ادنیٰ ملازم کے بیٹے کو داماد بنالوں۔ دنیا کیا کہے گی!'' وہ بے حد افسردگی سے بولے۔

''آپ صرف ہاں کہہ دیں باقی میں سنبھال لوں گی!'' وہ آبدیدہ ہوگئی۔ ''جذباتی بن کر کوئی فیصلہ مت کرو آرزو!'' ان کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ وہ اس کی جرأت پر اندر ہی اندر کھول رہے تھے۔

آخر آرزو کی عاجزی پر ان کا دل پسیج گیا۔ اس کی گیلی آنکھیں دیکھ کر وہ نرم پڑ گئے۔ آرزو ہی ان کی کل کائنات تھی۔ وہ اسے ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ آرزو کو سوچنے کی مہلت دیتے ہوئے ملائمت سے بولے۔

''میں صرف اس شرط پر تمھاری بات ماننے کو تیار ہوں کہ یہ شادی تبھی ہوگی جب ارمان کوئی اچھی سروس کر لے۔ ورنہ تمھیں میرا فیصلہ ماننا ہوگا!''

عباس میاں کا فیصلہ بے حد لچکدار تھا۔ انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ آرزو نے فوراً ان کی بات مان لی۔

پھر ایک صبح آرزو لان میں پڑی بید کی کرسی پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی کہ اخبار کے اندرونی صفحہ کے آخری کالم میں ایک اشتہار دیکھ کر اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا۔

معصوم علی کو اپنی نئی مل کے لیے ایک منیجر کی ضرورت تھی اور معصوم علی اس کے پاپا کی بے حد قدر کرتے تھے۔ پاپا کا ان پر بڑا احسان تھا۔ کئی بار آڑے وقتوں میں عباس میاں نے معصوم علی کی مدد کی تھی اور ان کے بھائی بھتیجوں کو اپنی وساطت سے سرکاری نوکریوں میں رکھوایا تھا۔

شام کو جب بڑی بی چائے کی ٹرے لے کر عباس میاں کے کمرے میں جا رہی تھی تو اس نے ٹرے اس کے ہاتھوں سے لے لی اور پاپا کے پاس پہنچ گئی۔ عباس میاں سمجھ گئے کہ

ضرور کوئی بات ہے۔ انھوں نے کہا۔

''اچھا ہوا تم آ گئیں۔ ابھی تمھارے معصوم انکل کا فون آیا تھا۔ ان کا بیٹا نوید کویت سے لوٹ آیا ہے۔ اور اب یہیں رہ کر وہ اپنا کاروبار سنبھالے گا۔ انکل تمھیں اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔ بولو کیا جواب دوں؟''

آرزو کچھ بولی نہیں۔ مسکرا کر اخبار کا وہ تراشا ان کے آگے رکھ دیا۔ جس میں اشتہار چھپا تھا۔ اشتہار دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر ایک لاپرواہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ بڑی ترش روئی سے بولے۔

''ایسے اشتہار تو اخبار میں آتے ہی رہتے ہیں۔ اس سے ان کی بکری تو ضرور بڑھ جاتی ہے مگر اُمیدواروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا!''

پاپا کی بے توجہی سے نہ تو وہ مایوس ہوئی اور نہ ہی اُمید کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹا۔ وہ پیار سے ان کے گلے میں باہیں ڈال کر بولی۔

''پاپا آج تک آپ نے میری کوئی بات نہیں ٹالی۔ پلیز میری یہ بات مان لیں!''

''ٹھیک ہے میں ارمان کے لیے معصوم علی کے نام ایک خط دے دیتا ہوں۔ تم ان سے جا کر مل لو۔ ارمان کو بھی ساتھ لے جانا اور معصوم علی سے کہہ دینا کہ میں خود اس سے ملنا چاہتا تھا۔ مگر مشغولیت کی وجہ سے نہیں آ سکا۔ تم اسی بہانے نوید کو بھی دیکھ لینا۔''

عباس میاں بڑے نبض شناس آدمی تھے۔ انھوں نے ارمان کے لیے سفارشی چٹھی لکھ کر آرزو کو دے دی۔

آرزو نے خط کو کئی بار پڑھا اور ارمان کو لینے چلی گئی۔ پھر کچھ دیر بعد جب اس کی کار ارمان کو لے کر گیٹ سے نکل گئی تو عباس میاں نے ڈائل گھمایا اور فون پر معصوم علی سے بولے۔

''معصوم بھائی آرزو ایک نوجوان کو ساتھ لے کر آپ کے پاس آ رہی ہے۔ میرا سفارشی لیٹر بھی ساتھ ہے۔ پلیز اسے خوبصورتی سے ٹال دینا۔ میں آپ کے سوال کا جواب بعد میں دوں گا!''

''اچھا ہوا آپ نے مطلع کر دیا ورنہ بیٹا کی بات ٹالنا میرے لیے ممکن نہیں تھا!''

معصوم علی کچھ اور بولنا چاہتے تھے مگر عباس میاں نے فون رکھ دیا۔ عباس میاں کی باتوں کا مفہوم سمجھ کر معصوم علی سخت ذہنی اُلجھن میں پڑ گئے۔ انھیں اپنی کہانی یاد آ گئی اور نہ جانے کیا سوچ کر ایک لمحہ کے لیے ان کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔

زندگی کے کسی خوبصورت موڑ پر انھوں نے بھی پیار کی گہری چوٹ کھائی تھی۔ انھوں نے اپنی پسند کی ایک لڑکی کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ مگر اونچ نیچ اور غریبی امیری کی آندھی اسے اُڑا لے گئی۔ اس زخم کی کسک آج بھی ان کے دل کو کچوٹتی رہتی تھی اور آج ان کے بہت پیارے دوست کی اِکلوتی بیٹی آرزو بھی اسی حادثے سے دوچار تھی۔ ابھی وہ اس خیال سے ذہن کو نجات بھی نہ دلا سکے تھے کہ آرزو ارمان کو ساتھ لیے ہوئے ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔

معصوم علی نے بہت پیار سے انھیں اپنے پاس بٹھایا۔ ان دونوں کے لیے کولڈ ڈرنکس منگوائیں۔

پھر معصوم علی نے ان سے آنے کی وجہ پوچھی تو آرزو کو اپنی بات کہنے کا موقع مل گیا۔ اس نے دھیرے سے پرس کھول کر عباس میاں کا خط اور ارمان کی درخواست ان کی طرف بڑھا دی۔

معصوم علی نے خط کو غور سے پڑھا ایک نظر ان کے چہروں پر ڈالی اور درخواست ایک طرف رکھتے ہوئے بولے۔

''دیکھو آرزو میں ارمان کو ایک ہفتہ پہلے کی تاریخ میں اپوائنمنٹ دے دیتا ہوں۔ تم اپنے پاپا سے کہ دینا کہ آپ نے جس شخص کے لیے نوکری کی سفارش کی ہے وہ تو پہلے سے میرے یہاں کام کر رہا ہے!''

آرزو اور ارمان نے چونک کر معصوم علی کو دیکھا وہ بڑی معصومیت سے زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔

OO

چسکا

جہاز انتہائی بلندی پر اپنی برق رفتاری کے ساتھ محو پرواز تھا اور نسرین اپنی سیٹ پر بیٹھی خیالوں میں غرق تھی۔ اس نے گھر لوٹتے ہوئے اس بات کا تہیہ کرلیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو اب وہ نوکری کے لیے کبھی کسی کھاڑی کے دیس کو نہیں جائے گی۔ کبھی نہیں!

کھاڑی کا ایک ایک واقعہ رہ رہ کر اس کے ذہن میں بجلی کی مانند کوندر ہا تھا۔ برسوں پہلے اس کے من میں بھی مڈل ایسٹ جانے کی بڑی چاہ تھی۔ خلیج میں کام کرنے والے چھٹیاں منانے جب گھر آتے تھے تو وہ ان کی شان وشوکت کو دیکھ کر کتنا مرعوب ہوتی تھی۔

اس کی ایک بے حد قریبی سہیلی کے چچا مرغوب صاحب دوبئی کی ایک تیل کمپنی میں بڑے افسر تھے۔ ان کی ٹھاٹ باٹ کا کیا کہنا۔ بڑے کروفر سے رہتے تھے۔ انھیں کمپنی کی جانب سے نہایت شاندار فلیٹ، اِمپورٹڈ کار اور وردی پوش ڈرائیور کے ساتھ ایک پہریدار بھی ملا ہوا تھا۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ سال میں ایک بار جب وہ گھر آتے تھے تو دوست احباب کے لیے ایسے نادر و نایاب تحفے لاتے تھے کہ دیکھ کر ہی طبیعت مچل اُٹھتی تھی۔

مرغوب صاحب کے دولڑکے دلّی میں پڑھتے تھے۔ انھیں پڑھائی کا بہت شوق تھا۔ ذہانت کے بھی بڑے تیز تھے دونوں۔ ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ میٹرک میں تو انھیں ایسی کامیابی ملی کہ ان کے نام پاس ہونے والوں میں سرِفہرست تھے۔ ان کی محنت اور لگن دیکھ کر ہی والدین نے دلّی میں ان کے رہنے کا بہت اچھا بندوبست کردیا اور کالج میں داخلہ سے پہلے ہی یونیورسٹی کے علاقے میں ایک نہایت عمدہ فلیٹ خرید کر انھیں دے دیا تا کہ

ہوسٹل اور گھر کے چکر میں ان کی پڑھائی کا حرج نہ ہو۔ مگر گھر سے دُور جہاں انھیں ٹوکنے والا کوئی نہ تھا اور دولت کی فراوانی تھی۔ دونوں دلّی کی خوبصورتی میں کھو گئے۔ گھر میں بلاناغہ دوستوں کی محفلیں جمنے لگیں اور رفتہ رفتہ تاش کے پتّے پھینٹنے کی ایسی لت پڑ گئی کہ پڑھائی سے دلبرداشتہ ہونے لگا۔ دونوں دو سال سے انٹرمیڈیٹ میں ہی فیل ہو رہے تھے اور ماں لڑکوں سے ملنے کے بہانے اکثر اپنے عاشق کے ساتھ دلّی گھومنے نکل جاتی تھی۔

نسرین لکھنؤ کے ایک متوسط گھرانے میں پڑھ لکھ کر جوان ہوئی تھی۔ اس کی تین چھوٹی بہنیں اور تھیں۔ باپ کی اچانک موت کے بعد گھر کی ساری ذمے داریاں اس کے سر آ گئی تھیں۔ مگر وہ پست ہمت نہ ہوئی اور بی۔اے کے بعد اسے بدیس جانے کا موقع بھی مل گیا۔

پچھلے سال جب نصرت کے چچا دوبئ سے آئے تھے تو وہ اس کے ہمراہ ان سے ملی تھی اور دوبئ جانے کا اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ پہلے تو چچا نے اسے بدیس نہ جانے کی صلاح دی مگر جب وہ نہیں مانی تو انھوں نے بمبئ فون کر کے اپنے ایک واقف کار سے اس کی بات چیت کرا دی۔ سہراب بھائی ملازمت کے خواہش مندوں کو کھاڑی کے ملکوں میں بھیجنے کا دھندہ کرتا تھا۔ اس نے جلد ہی دوبئ کے ایک شیخ کی نجی کمپنی میں اس کی ملازمت طے کرا دی اور اسے دوبئ بھیجنے کا سارا انتظام بھی کر دیا۔

نسرین دوبئ پہنچ کر بے حد خوش تھی۔ اس کے دوبئ پہنچنے سے پہلے ہی سہراب بھائی کے آدمیوں نے اس کے رہنے سہنے کا سارا انتظام کر دیا تھا۔ دوسرے ہی دن اس نے کمپنی میں اپنی ڈیوٹی بھی جوائن کر لی۔

کمپنی کے مالک پچاس سالہ شیخ نے جب نسرین کو دیکھا تو وہ اس کے بدن کی مقناطیسی کشش میں ایسے بے خود ہو گئے کہ اس کے حسن سے سیراب ہونے کی چاہ ان کے من میں جاگ اُٹھی۔ اسے رِجھانے کے لیے انھوں نے اس پر اپنی مہربانیوں کے دریچے کھول دیئے اور کمپنی کے خوبصورت گیسٹ ہاؤس کے ایک مخصوص کمرے میں اس کے رہنے کا بندوبست کر دیا۔ جہاں ان کے ذاتی مہمان ٹھہرا کرتے تھے۔ اس کمرے کی خادمہ بھی الگ تھی جو

وہاں مہمانوں کی دیکھ بھال کے لیے ہمہ وقت موجود رہتی تھی۔

ایک روز جب شیخ اس کی مزاج پرسی کے لیے گیسٹ ہاؤس پہنچے تو خادمہ دروازے پر ہی مل گئی۔ انھوں نے بوڑھی خادمہ کو کچھ لانے کے لیے کہیں بھیج دیا اور دبے پاؤں نسرین کے کمرے میں چلے آئے۔ نسرین آئینے کے سامنے بیٹھی بال سنوار رہی تھی۔ بکھرے گیسوؤں کے درمیان اس کا چہرہ غضب ڈھا رہا تھا۔ اچانک آئینے میں وہ شیخ کو اپنے اتنا قریب دیکھ کر چونک اٹھی۔ جلدی سے بال ٹھیک کیے اور ساڑی کو ڈھنگ سے کندھے پر جماتے ہوئے وہ ان کے استقبال کو آگے بڑھی۔

''آپ بیٹھیے میں چائے بنا کر لاتی ہوں!''

''ارے چھوڑو بھی۔ جتنی مٹھاس تمھاری باتوں میں ہے اتنی چائے میں کہاں ہو گی؟''

شیخ اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے بستر پر بیٹھ گئے۔ نسرین ان کی اس جسارت پر دنگ رہ گئی۔ پیچھا چھڑانے کی کوشش کی تو شیخ نے اسے بانہوں میں بھر کر اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ شرم کے بوجھ سے نسرین کی آنکھیں جھک گئیں۔

شیخ نے نوٹوں سے اس کا دامن بھر دیا۔ وہ نوٹوں کی چمک دمک میں سب کچھ بھول گئی۔ نہ جانے یہ شیخ کی شخصیت کا اثر تھا یا دولت میں کھیلنے کی ہوس کہ وہ کچھ بول بھی نہیں پائی۔

پھر تو جب بھی شیخ کی مرضی ہوتی وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے چلے آتے اور اس کے دل میں ارمانوں کی نئی قندیلیں روشن کر جاتے۔

ملاقات کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک روز اچانک شیخ کے سینے میں درد اٹھا۔ سانس لینے میں تکلیف محسوس ہونے لگی تو وہ علاج کے لیے امریکہ چلے گئے۔

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ جب سے شیخ کے لڑکے کی نظر نسرین پر پڑی تھی وہ اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس کے خدوخال تھے ہی کچھ ایسے کہ نظریں ملتے ہی دل پگھل جائے۔ وہ نسرین کی ذات پر دولت لٹانے لگا تو نسرین بھی ایسی احسان فراموش نہیں تھی کہ وہ اس کے

ارمانوں کی قدر نہ کرتی۔

پھر تو وہ اس کے ہونٹوں کے پیمانے کی اتنی عادی بن گئی کہ اسے اس کا انتظار رہنے لگا۔

وقت کو جیسے پر لگ گئے تھے۔ نہ رفتار بدلی، نہ سمت، بنا رُکے کہیں دن تیزی سے بھاگتے جا رہے تھے۔ مگر نسرین جوانی کے نشے میں چور اپنے کرم فرماؤں کو جامِ صحت پلا کر نذرانے وصول کرنے میں مگن رہی۔ اس پر انعام و اکرام کا سلسلہ لمبا اور لمبا ہو گیا تھا۔ اسے حیرت تھی۔ وہ اتنی جلد کیسے بدل گئی۔ وہ آزاد خیال تو شروع سے ہی تھی۔ کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا تو ضرورت سے زیادہ ہی پر پھیلا دیئے۔ باہر ملکوں میں زندگی کتنی مصروف ہوتی ہے۔ سب اپنے آپ میں گم، کون کس کو ٹوکے؟ یہاں تو کبھی کبھار کسی کو سوچنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔

ایک مرتبہ دفتر میں کئی روز کی چھٹی تھی۔ شیخ کا لڑکا کچھ دنوں کے لیے باہر گیا ہوا تھا۔ ایسے میں شیخ کے شوفر نے اسے گھومنے کے لیے چلنے کو کہا تو وہ انکار نہ کر سکی۔ اکیلے پڑے بور ہونے سے تو اس کے ساتھ کہیں گھوم آنا اسے اچھا لگا اور وہ تیار ہو گئی۔ ویسے شوفر تھا بھی بڑا شوخ اور شرارت پسند۔ اس کی پیشکش ٹھکرا کر وہ اس کی دوستی سے محروم ہونا نہیں چاہتی تھی۔

سیر و تفریح میں وقت کا کچھ خیال نہ رہا۔ لوٹنے میں ذرا دیر ہو گئی تو شوفر نے اسے اپنے کوارٹر میں ہی ٹھہرا لیا۔

جب دونوں بستر پر جانے لگے تو شوفر نے بڑے پیار سے اس کے گلے میں سونے کا ایک ہار ڈال دیا اور مسکرا کر اپنی بانہیں پھیلائیں تو وہ شکر گزار ہو کر اس کی بانہوں میں سمانے سے خود کو روک نہ سکی اور دونوں دیر تک ایک دوسرے کو اپنے پیار میں شرابور کرتے رہے۔

دولت بٹورنے کا کوئی بھی موقع نسرین نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ خوشیاں بانٹنے اور پیار لٹانے میں اتنی منہمک رہی کہ اسے وقت گزرنے کا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ دن اور مہینے ہفتوں کی طرح گزر گئے۔ یہاں تک کہ سال پورا ہونے کو آ گیا اور اس کی نوکری کی معیاد ختم ہو گئی۔

مگراس مدت میں ہی اس نے اتنی دولت جمع کرلی تھی جتنی برسوں میں کوئی بڑے سے بڑا افسر بھی کما نہیں سکتا تھا۔ مگر یہ سوچ کر اس کا چہرہ کمھلا گیا کہ اتنا کچھ پالینے کے بعد بھی اسے کیا ملا۔ اپنا سب کچھ گنوا کر جو دولت اس نے پائی ہے وہ اسے خوشحالی تو دے سکتی ہے، اس کا کنوارا پن نہیں لوٹا سکتی، جس کی کسک میں وہ ساری عمر جلتی رہے گی۔

رختِ سفر باندھتے ہوئے اس نے پختہ ارادہ کرلیا کہ خواہ کچھ بھی ہو اب وہ نوکری کے لیے کبھی کہیں باہر جانے کا خیال بھی دل میں نہیں لائے گی۔

جہاز کی رفتار اپنی جگہ برقرار تھی۔ تبھی اعلان ہوا کہ جہاز کچھ ہی دیر میں ممبئی ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے والا ہے۔ سب نے اپنی اپنی پیٹیاں کس لیں۔

نسرین نے بھی خیالوں سے چونک کر اپنے بیلٹ کسے اور کھڑکی کی طرف دیکھا۔ دور نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں اپنی ڈار سے بچھڑا کوئی پرندہ بھٹک رہا تھا اور نیچے چاروں طرف آخری دُھوپ اپنے پر سمیٹ رہی تھی۔ جہاز ایئرپورٹ کے چکر لگا کر رن وے پر اُتر گیا۔

نسرین کی نظر ماں پر پڑی تو خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ اسے لینے پہلے سے ہوائی اڈّے پر موجود تھی۔ ضابطے کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد نسرین ماں کے ساتھ اپنے سارے سامان ٹیکسی میں لدوا کر گھر لوٹ آئی۔

گھر پہنچتے ہی سب نے اسے گھیر لیا۔ کیا اپنے کیا پرائے۔ آنگن میں عورتوں اور بچوں کی بھیڑ لگ گئی۔

وہ مزے لے لے کر سب کو کھاڑی کے حالات سناتی رہی۔ سبھی بڑے انہماک اور دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ روداد سفر بیان کرتے ہوئے ان پر اپنی برتری کا احساس بھی جتاتی جارہی تھی۔ بھائی بہن اور سہیلیاں تحفے تحائف پا کر بے حد خوش تھیں۔ مسکرا تو وہ بھی رہی تھی، مگر اس کا من اندر سے ڈول رہا تھا۔

ایک عرصہ سے نسرین نے زندگی کا جو خاکہ اپنے ذہن میں ترتیب دے رکھا تھا، فرصت پاتے ہی وہ اس میں اپنی پسند کے رنگ بھرنے لگی۔ لکھنؤ شہر کی سب سے خوبصورت

بستی میں اس نے ایک شاندار فلیٹ خرید کر جلد ہی اس میں رنگ و روغن چڑھانے کا کام پورا کرلیا۔ مگر اس کی سجاوٹ اور آرائش میں اتنے ساز و سامان جٹانے پڑے کہ۔ لاگت تخمینے سے دوگنی بڑھ گئی۔

حالانکہ وہ ماں کے لیے گرم کپڑے۔ بہنوں کے زیورات اور بہت سارے قیمتی سامان اپنے ساتھ لائی تھی۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے پیسے ختم ہو گئے تو وہ سوچ میں پڑ گئی اور اچانک ہی اس نے دوبئی جانے کا فیصلہ کرلیا۔ سہراب بھائی سے رابطہ قائم کر کے اسے اپنی نوکری کے سارے کاغذات بھیج دیئے اور روانگی کے لیے جہاز کے ٹکٹ کا انتظار کرنے لگی۔

OO